مشکلات القرآن

مطالعۂ قرآن

بیسویں صدی میں

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ھجرہ انٹرنیشنل پبلشرز
میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ لاہور

مشکلات القرآن

مطالعۂ قرآن

بیسویں صدی میں

مولینا عبدالماجد دریابادیؒ

ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز
میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور

DATA ENTERED

ط ۲۹۷۶۱۰
م ۵ ا ع
۲۴۷۱۹

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل: ۱۹۸۴ء

ناشر:
ذوالفقار احمد
یوسف اختر

مطبع:
امپرنٹ آفسٹ پرنٹرز

کتابتِ سرورق:
جمیل احمد قریشی تنویر رقم

قیمت:
تیس روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

پیش نظر مجموعہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ان قرآنی خطبات پر مشتمل ہے جو انھوں نے عبد الشکور میموریل کے سلسلہ میں مدراس کے معزز و مخیر تاجر جناب الحاج ٹی عبد الواحد صاحب سابق ایم پی کی فرمائش و خواہش پر قلم بند کئے تھے اور نیو کالج مدراس کے وسیع ہال میں ۲۸ جولائی سنہ ۷۰ء سے یکم اگست سنہ ۷۰ء تک پڑھ کر سنائے گئے تھے، ان جلسوں کی صدارت کی خدمت ان سطور کے راقم کے سپرد ہوئی تھی، جس نے اس کو اپنی حیثیت سے واقف ہونے کے باوجود حاجی صاحب کے احترام، اور اپنی ایک بڑی سعادت سمجھ کر قبول کیا تھا، ان جلسوں میں مولانا کا نام سنکر نہ صرف شہر مدراس، بلکہ بنگلور، میسور تک کے اہل ذوق علماء و فضلاء، جدید دانش گاہوں کے اساتذہ و طلبہ اور مولانا کے عقیدت مند و نادیدہ مشتاق جمع ہو جاتے تھے، شاید اس سے پہلے بہت عرصہ سے یہ وسیع ہال شائقین سے اس طرح نہ بھرا ہوگا جیسا کہ اس موقع پر وہ بھرا پرا نظر آتا تھا، یہ سب خطبات نہایت ذوق و شوق اور سکون و خاموشی کے ساتھ سنے گئے، راقم السطور نے اپنی پہلی تقریر میں یہ کہا کہ عن قریب وہ زمانہ آنے والا ہے، جب لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو دیکھا، اور ان کی زبان سے کچھ سنا تھا، کہنے والے کو بھی اس کا احساس نہ تھا کہ یہ زمانہ اتنی جلد آجائیگا، یہ عقیدت مند قلم جو مدظلہ لکھنے کا عادی تھا اسکو رحمۃ اللہ علیہ اور مرحوم و مغفور لکھنا پڑے گا، اس کا بھی قلق ہے کہ یہ کتاب بعض حوادث اور مجبوریوں کی بنا پر ان

مفید خدمت انجام دی جس کے بہت سے وہ لوگ شکار ہو گئے تھے جن کی ایک عمر ان عقلی علوم کے مطالعہ میں گذری تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے لوگوں کے ایمان بچ گئے، اور کتنے لوگوں کے ایمان میں نئی طاقت و توانائی پیدا ہو گئی۔

اب یہ نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفۂ یونان کے بجائے، تجربی علوم، سائنس، (بالخصوص طبیعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے اکتشافات و تحقیقات ہو رہی تھیں، تاریخ و جغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کر لی تھی، جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی، بہت سے قدیم تاریخی مسلمات اور جغرافیائی روایات محل نظر، بلکہ خلاف واقعہ سمجھی جانے لگی تھیں، نئی کھدائیوں اور آثار قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی تھی، اس سب سے عالم اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقہ پر ایک نئی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء و متکلمین اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ و حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، اور انھوں نے علمی و عقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔

اس کار عظیم کو انجام دینے کے لیے کم سے کم ہمارے ملک میں مولانا عبد الماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمر ہمت باندھی، اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا، اس کام کی تکمیل کے لیے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے، اس لئے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا، وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلہ سے وہ کبھی بچھڑنے نہیں پائے، اور اس تفسیری خدمت کے دوران

کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، اب یہ مقدمہ کی چند سطریں اس وقت لکھی جا رہی ہیں، جب ان کی وفات پر پورا ایک مہینہ بھی نہیں گذرا ہے۔

جس کتاب آسمانی کے متعلق "ثم ان علینا بیانہ" اور "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کی پیشین گوئیاں خود اسی کتاب میں موجود ہیں، اس کے لئے یہ انتظام خداوندی بالکل قرین قیاس، اور قطعاً لائق تعجب نہیں ہیں کہ اسکے اعجاز و صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ہر دور میں غیبی اور تقدیری انتظامات کئے جاتے رہیں، علوم و فنون، فکر انسانی کی ترقیاں، نئے نئے اکتشافات و معلومات جو نئے سوالات پیدا کر دیتے ہیں، اس کتاب پر ایمان رکھنے والے، اور اس سے عشق و محبت کرنیوالے، اور اس کے لیے زندگیاں وقف کر دینے والے علماء ان سوالات کے جواب دینے کا بیڑا اٹھائیں، اپنے علم و مطالعہ، تدبر فی القرآن، جدید علوم سے واقفیت، اور اپنی محنت سے قرآن مجید کے اعجاز و صداقت کو بے نقاب کریں، اس کے ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان علم کی نارسائی، عقل کی کوتاہی اور فکر و نظر کی سطحیت سے جو موہوم حجابات، اور خیالی خلیج پڑ جاتی ہے اس کو دور کر دیں، اور ہر زمانہ میں اسکو ایک "زندہ جاوید" کتاب ثابت کریں، جب ساری دنیا کو اس کے لفظی اعجاز، اور اسکی ماوراء انسان بلاغت کی طرف توجہ تھی، اور اس کی صداقت کا یہی معیار سمجھا جاتا تھا، تو باقلانی، رمانی اور جرجانی نے "اعجاز القرآن" اور "دلائل الاعجاز" کے نام سے کتابیں لکھیں، اور خدا نے زمخشری، اور بیضاوی جیسے نکتہ شناس اور دیدہ ور پیدا کئے، جب علوم عقلیہ اور فلسفۂ یونان کے سحر و افسون سے سارا عالم اسلام مسموم و مسحور نظر آنے لگا، تو خدا نے امام فخر الدین رازی جیسا مفسر پیدا کیا، جس نے ان عقلی و فلسفیانہ اعتراضات کا جواب دیا جو ان علوم کے سطحی النظر مقلد، قرآن مجید کے غیبی حقائق اور ماوراء عقل علوم و مضامین پر وارد کرتے تھے، ان کی تفسیر نے (جس کے ساتھ بہت سے ناقدین نے ناانصافی سے کام لیا ہے۔) اس مرعوبیت اور احساس کہتری کو دور کرنے میں بڑی

میں تو انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو، سالہا سال کی اس کوشش و مطالعہ، اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی، اور اردو کی تفسیر ہے، اور یہ مضامین اس کے خاص انتخابات اور تشریحات پر مشتمل ہیں، جو انھوں نے درس میں اپنے خطبات کے موقعہ پر پیش کیے، امید ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والوں اور اہل ذوق کے لئے معلومات افزا اور بصیرت افروز ثابت ہوں گے اللہ تعالیٰ اس کتاب کو بھی مولانا کی علمی خدمات اور دینی حسنات میں شامل فرمائے، اور ناظرین کو زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔

ابوالحسن علی ندوی

فروری ۷۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہٖ وازواجہٖ وصحبہٖ اجمعین

۱۱-۱۲ سال قبل جنوری ۱۹۵۵ء میں آپ کے اس شہر میں اول بار حاضری ہوئی تھی اور آپ حضرات کے اخلاص کی برکت سے ایک نئی چیز "سیرتِ نبویؐ قرآن مجید سے" وجود میں آگئی تھی، ابکی پھر آپ حضرات کے لطف و کرم نے کھینچا اور اگرچہ وہ اخلاق مجسم ہستی آپ کے درمیان اب موجود نہیں جس کا نام افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی تھا، پھر بھی اس خادم سے انکار و اعراض نہ بن پڑا اور بصارت کی روز افزوں معذوری کے باوجود حاضر ہو جانا ہی پڑا۔

(اب کے موضوع ہے "مشکلات القرآن" اور دوسرا عنوان اسی پہلے عنوان کی شرح و توضیح "قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں" اور مقصد یہ ہے کہ آج کے طالب علم کے ذہن میں قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران میں جہاں جہاں کچھ کھٹک پیدا ہوتی ہے اسے اپنے امکان بھر رفع کر دیا جاتا رہے اور اس کا ایمان اس پر بے غبار قائم رہے۔ یہ کوشش ایسے شخص کی طرف سے ہو رہی ہے جو علم سے بے بہرہ اور عمل سے بالکل ہی کورا ہے۔ پھر بھی ایک عمر سے عادت قرآن سے لگے لپٹے پڑے رہنے کی ہو گئی ہے اور اسی لئے کچھ تھوڑی بہت کشود کار تو قرآن کے نازل کرنے

والے کے فضلِ بیکراں سے ہو ہی گئی ہے ——— جس کا یہ کلام ہے وہ اگر چاہے تو جاہل سے جاہل کے لئے بھی پتھر کو پانی بنا دے۔

ظاہر ہے کہ ان معروضات میں کوئی شے بالکل نئی نہ مل سکے گی وہی چیزیں ملیں گی جنھیں اپنی اُردو تفسیر قرآن کے پہلے ایڈیشن میں عرض کر چکا ہوں اور وہ اب زیرِ طبع دوسرے اڈیشن میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش ہو رہی ہیں، سامعین با تمکین کے لطف و کرم سے توقع ہے کہ وہ اس تکرار کو بھی بے مزہ اور خالی از نفع نہ پائیں گے۔

قرآن کی خدمت صدیوں سے ہوتی چلی آئی ہے اور بے شمار شرحیں اور تفسیریں اب تک لغوی اور نحوی، ادبی اور فلسفیانہ، فقہی اور کلامی، معقولی اور منقولی پہلوؤں سے لکھی جا چکی ہیں۔ اضافے کی ضرورت پھر بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گی۔ اللہ کے کلام کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کر لینا کس بندے کے بس کی بات ہے؟

امام فخر الدین رازی کی وفات سنہ ۶۰۶ ہجری میں ہوئی ہے اور ان کی کرامت کے لئے یہ کافی ہے کہ انھوں نے سارے متعلقہ علوم عصری کو قرآن کے خادم کی حیثیت سے اپنی تفسیر میں لا کھڑا کیا ہے۔

وہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا اور اب چودھویں صدی کا اختتام ہے حکمتِ الٰہی سے بعید کیا ہے کہ ان کے کسی کفش بردار کو مزید توفیق دے دے کہ انھیں کے دکھائے ہوئے راستے پر پرانے علوم کو نئے سے بدل دے۔

بہر حال ایک خام کار سے جو کچھ بن پڑا آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اللہ انھیں حسنِ قبول عطا فرمائے اور اب آپ کی اجازت سے وہ معروضات پیش ہوتے ہیں۔

اگست سنہ ۱۹۷۰ء

عبد الماجد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا خطبہ

(۱)

سورۃ البقرہ چوتھے رکوع کے شروع میں آیت نمبر ۳۰ آتی ہے

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

یاد کے قابل

"اور وہ وقت بھی یاد کے قابل ہے جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں، وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں، اللہ نے فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

ظاہر ہے کہ جس وقت کا یہ مکالمہ ہے اللہ کی جناب میں ایک نوری مخلوق فرشتہ کے نام سے آباد تھی، اور یہ زمین بھی موجود تھی۔ اور اب اس میں ایک نئی مخلوق آباد ہونے جا رہی تھی، جس کا کام زمین پر احکام قانونی و تشریعی کا نافذ کرنا ہوگا اور ذی شعور مخلوق کے درمیان نظم و انتظام کرنا، ورنہ قانون تکوینی و طبعی کے انصرام کے لئے تو فرشتے موجود ہی تھے اور یہ کارخانۂ حیات ان کے ذریعہ اور واسطہ سے بہرحال چل ہی رہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی بالکل

نئی صنف کی مخلوق کا وجود میں لانا مقصود تھا۔ اور جب ہی تو اس تخلیق کا ذکر قصد و اہتمام کے ساتھ فرمایا گیا۔ ورنہ صفت خلاقی کے اظہار سے تو قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ اور ساری خلقتوں کا ذکر سادہ فعل خلق کے ساتھ صیغۂ ماضی (خَلَقَ) یا مضارع (یَخْلُقُ) کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جنت اور عرش اور کرسی تک کی محض آفرینش یا وجود کا ذکر ہے، قصدِ آفرینش کا نہیں۔ تو غرض کچھ اس اہتمام ذکر سے اور کچھ اپنی طبعی فراست اور دانائی سے فرشتوں نے بھانپ لیا، کہ اس خلیفۂ الٰہی کی ترکیب کن عنصروں سے ہوگی اور اس کی سرشت میں کیا کچھ رکھ دیا جائے گا۔ یہ سوچ سمجھ زبانِ سوال پر کھلی اور پورے آدابِ عبدیت کے لحاظ کے ساتھ کھلی، کہ کیا حضور والا ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو زمین پر فساد اور باہم خوں ریزی کرتی رہے گی؟ دراں حالیکہ ہم تو اطاعت و حمد و تسبیح میں لگے رہتے ہیں ـــــ یہ پیرایۂ بیان چونکہ استفہامی ہے اس لئے بعض اچھے اچھے مفسرین اور محققین اس بھول میں پڑ گئے کہ سوال بطور اعتراض ہے یعنی یہ آپ ایسی مخلوق کیسے وجود میں لا رہے ہیں جو آپ ہی کے لئے تکلیف اور تکدر کا باعث ہوگی۔ اہلِ تفسیر میں سے اب نام کس کس کا لیا جائے، قدما میں سے متعدد اہلِ نظر اسی طرف چلے گئے ہیں، اور ایک اشکال اپنی تفسیر و تعبیر سے پیدا کر دیا ہے۔ حالانکہ ایسی نوری اور معصوم مخلوق سے کسی معصیت، اور پھر گستاخانہ معصیت کے صدور کا تو امکان ہی نہیں پیدا ہوتا۔ "باغی" فرشتوں کا تخیل تمام تر مسیحیانہ ہے، نہ کہ اسلامی، بلکہ عجب نہیں کہ عیسائیوں ہی کے رابطہ اور آمیزش سے یہ خیال مسلمان علماء میں سرایت کر آیا ہو۔

أَتَجْعَلُ کا ہمزہ کھلا ہوا استفہامی ہے لیکن چوتھی ہی صدی کے شروع کے لغوی ابو عبیدہ (وف ۲۱۰ھ) نے اسے صاف کر دیا کہ:-

> جاءت مع لفظ الاستفهام ولكن معناه الايجاب (اعجاز القرآن)
>
> "ہمزہ گو لفظاً استفہامی ہے لیکن معناً کام ایجاب کا دیتا ہے۔"

اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کلام میں کوئی پہلو طنز یا اعتراض کا نہیں، بلکہ یہ مبنی ہے تمام تر وفورِ عبودیت اور فرطِ نیازمندی پر اور مرادف ہے اس کے کہ آخر ہم غلامانِ بارگاہ کس دن، اور کس خدمت کے لئے ہیں؟ جو ارشاد ہونا ہے ہم ہی سے ہو، نہ کہ اس نئی مخلوق سے جو اپنی سرشت اور طبیعت کے لحاظ سے یقیناً گرانیٔ طبع کا باعث ہو گی؟

مفسر جلیل حافظ ابن کثیر کے ہاں ہے:

ليس على وجه الاعتراض على الله وعلى وجه الحسد لبني آدم كما يتوهمه بعض المفسرين

"اس میں نہ کوئی اعتراض ہے اللہ تعالیٰ پر اور نہ حسد ہے بنی آدم پر، جیسا کہ کسی کسی مفسر کو وہم ہو گیا ہے۔

اور اس سے ملتی ہوئی عبارت قاضی بیضاوی کی بھی ہے

وليس اعتراض على الله تعالىٰ ولا طعن في بني آدم على وجه الغيبة فانهم اعلىٰ من ان يظن بهم ذلك۔

اور سب سے بڑھ کر تشفی بخش اس سلسلہ میں وہ تحریر ہے جو ہمارے شیخ وقت مفسر تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرمائی ہے، ملاحظہ ہو:۔

"مطلب یہ ہے کہ ہم سب کے سب آپ کے فرماں بردار ہیں، اور ان میں کوئی مفسد و سفاک بھی ہوگا۔ اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لوگ لگ لپٹ کر اس کو انجام دے لیں گے۔ یہ سب لوگ اس کام کے نہ ہوں گے ان میں سے جو مطیع ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے، مگر جو مفسد و ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ اس کام کو انجام دیں۔ خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کوئی کام کا اہل نہ ہوگا۔ اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟"

(ختم ہوئی مفسر تھانوی کی بات)

حکایت کا حکیمانہ خاتمہ فرشتوں کے اس اعتراف پر ہوتا ہے کہ بیشک طرح طرح کی مخلوقات کی ضرورتوں کا، اور پھر ہر ایک کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا پورا علم بھی تجھ ہی کو ہو سکتا ہے۔ ہمارے تھوڑے سے اور محدود علم کو نسبت ہی تیرے غیر محدود اور بے پایاں علم سے کیا ہو سکتی ہے۔ حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرپور بے شک تیرا ہی ہر حکم اور ہر فیصلہ ہو سکتا ہے ـــــ قرآنیات کے طالب علم کو شروع میں ایک دشواری یہ پیش آئی، لیکن قرآن ہی کی برکت سے بحمد اللہ حل بھی ہو گئی!

(۲)

اسی طرح تیسرے رکوع کا شروع حکم توحید سے ہوتا ہے، اور اس کے معاً بعد کی آیت میں بیان ایجاز و اجمال کے ساتھ خلقت کائنات کا ہے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

"وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت اور اس نے اُتارا آسمان سے پانی۔ اور پھر (اس نے) تمہارے لئے غذا کو پھل پیدا کر دیے۔ سو تم اللہ کا (کوئی) ہمسر نہ ٹھہرانا۔ اور تم جانتے (بوجھتے) بھی ہو۔"

یہاں زمین و آسمان کی نہ ہیئت کا بیان ہو رہا ہے، نہ ان کی ماہیت ارضیاتی و فلکیاتی کا۔ ان علمی اور فنی یا سائنسی پہلوں سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ قرآن نے یہاں دونوں کا ایک ایک وصفِ امتیازی چُن لیا۔ اور ان ہی کے بیان پر اکتفا کر لی۔ زمین کا وصف تو یہ

بیان کیا کہ وہ انسان کے لیئے بمنزلہ فرش ہے۔ وہ گول ہو تو، اور چوکھنٹی ہو تو، ہر صورت میں انسان کے پیروں کے نیچے ہے، انسان اس پر چاہے چلے پھرے، بیٹھے لیٹے، دوڑے یا سوئے ہر حال میں یہ اس کے نیچے فرش کا کام دے گی، اس پر جو سواری بھی اس کا جی چاہے چلائے، گھوڑے اور خچر، اور بیل اور اونٹ اور سائیکل اور ریل اور موٹر۔ ہر حال میں وہ اسے سنبھالے رہے گی اور اس کا بوجھ اٹھائے رہے گی۔ انسانی ضرورتوں کے لیئے یہ ٹھوس اور ہموار اور مسطح ہے، نہ کھردری، نہ پلپلی، نہ کھوکھلی نہ پچپچی، کہ بیٹھ جائے یا دھنس جائے۔ یا اپنے اندر نگل لے۔

اسی طرح السماء کا وصفِ خصوصی اس کی بلندی کو چن لیا اور الارض کی پستی یا فرشیت کے مقابل اس کی بلندی یا رفعت کو بیان کر دیا۔ کہ وہ تو انسان کے لئے بمنزلۂ چھت کے ہے۔ اس کے ٹھوس اور خول ہونے سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ بحث صرف اس سے ہے کہ وہ سب سے بلند چیز ہے۔ چھت کی طرح نسل انسانی کو ہر طرف سے ڈھانپے ہوئے۔ انسان جتنا بھی چاہے اچھلے کودے، جس بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی پر چاہے چڑھتا جائے ہوا میں جتنی بھی اڑان دکھائے، خلا میں زیادہ سے زیادہ قلابازیاں کھاتا رہے۔ بہرحال آسمان کے نیچے ہی رہے گا۔ کسی صورت میں اس سے باہر نکل کر نہ جا سکے گا۔

تیسری بات آیت میں یہ بیان کر دی کہ انزل من السماء ماء کہ آسمان سے پانی اسی پروردگار نے اتارا ہے۔ یہ معنی اس کے ہر گز نہیں کہ چھت کے اوپر، پانی کا لامحدود ذخیرہ کوہ قامت ٹنکیوں کے اندر محفوظ ہے۔ اور اللہ ان کی ٹونٹیاں جب چاہے کھول کر زمین پر پانی برسا دیتا ہے۔ یہ بھی اللہ کیلئے بالکل آسان ہوتا۔ سوال امکان کا نہیں، واقعہ کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کی کتابوں نے جو لمبا اور سلسلہ وار طریقہ بیان کیا ہے یعنی سمندر کے پانی کا گرمی پا کر بھاپ کی شکل میں تبدیل ہونا، اس کا بادل کی شکل

اختیار کر کے اوپر اُٹھنا، ہواؤں کے سہارے فلاں اور فلاں سمت میں منتقل ہونا اور فلاں درجہ کی حرارت پا کر پانی کی بوندیں یا قطرے بن جانا، پھر فلاں مقدار میں نازل ہونا وغیرہ۔ اس ساری داستان مفصل و مطول کا خلاصہ و ماحصل دو لفظوں میں بیان کر دینا قرآن ہی کا اعجاز ہے، اس کو درمیانی واسطوں اور سلسلۂ اسباب سے کوئی بحث نہیں۔ یہ کام تو مادی مشاہدوں اور تجربوں سے لینا تو عقل کے سپرد کر دیا گیا ہے، اور علوم طبعی کے حوالہ سے قرآن مجید نے تو صرف اتنا بتا دیا کہ پانی برسانا کام اللہ ہی کا ہے، نہ کہ کسی اور کا، جس طرح اس نے زمین کی فرشیت اور آسمان کی بلندی کی تخلیق کو اپنی جانب منسوب مخصوص کر لیا تھا۔

چوتھی بات آیت میں یہ بتائی کہ فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ اس نے پانی کے ذریعہ تمہارے لیئے غذا کو پھل اُگا دیے۔

الثمرات کے تحت میں غلّے، ترکاری، ساگ پات اور پھل پھلاری، سب ہی زمین سے اُگنے والی غذائیں آگئیں۔ سائنس کے کسی بیان سے قرآن کا کہیں ٹکراؤ نہیں۔ قرآن نے تو بس اتنا بتا دیا کہ کائنات میں جو کچھ اور جس طرح بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تمہاری آنکھیں دیکھتیں اور تمہارے حواس محسوس کرتے ہیں یہ ساری کاریگری اور صنعت اور تخلیق دونوں عالم کے پروردگار ہی کی ہے۔ اور آیت کا توڑ اس پکار پر کیا ہے کہ:۔

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥

"اللہ کا ہمسر کسی کو بھی نہ ٹھہراؤ (نہ کسی انسان یا جن یا فرشتہ کو، نہ کسی چرند پرند حیوان کو، نہ کسی دریا یا پہاڑ کو، نہ کسی سائنسی فارمولے یا طبعی قانون و قاعدہ کی کسی دفعہ کو) اور تم جانتے بوجھتے بھی ہو۔"

یعنی اتنی موٹی حقیقتیں تو عام فہم ہیں۔ انسانی فہم پر روشن و واضح۔ یہ کوئی دقیق و غامض

علمی نکتے اور عقلی اسرار و رموز نہیں۔

آفرینش کائنات و اجزاء کائنات سے متعلق قرآن کا عام انداز بیان یہی ہے کہ وہ اسباب و جزئیاتِ اسباب کی طرف نہیں جاتا بلکہ سارا زور خالق و مخلوق کے ربط و تعلق پر دیتا رہتا ہے، اور گھوم پھر کر ذہن انسانی کو اس نقطہ پر لاتا ہے کہ ایک خالق کل ناظمِ کل، حاکم کل، قادر کل کو مان لینا آسان تر اور زیادہ قرین عقل ہے، یا ہزارہا ہزار وسائط کے جنجال میں پڑے رہنا؟

۳

قرآنیات کے طالب علم کو ایک اور دھچکا اس وقت پہنچتا ہے، جب وہ سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع کے شروع میں اس آیت پر پہونچتا ہے:

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ
وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ (آیت ۴۷)

”اے بنی اسرائیل میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا۔ میں نے تمھیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی“۔

اور اسی مفہوم کی اور آیتیں بھی آگے چل کر قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو عام طور پر مرادف یہود کے سمجھا گیا ہے اور جس انعام کو یاد دلایا گیا ہے اس انعام سے مراد دنیوی انعام، ملک و مال، دولت و شوکت سمجھا گیا ہے۔ یہ مفہوم لے کر اب تاریخ کے اوراق سے سوال ہوتا ہے کہ یہ بے مثل و بے نظیر اقبال اس کے کس دور میں اور عالم کے کس خطہ میں یعنی کب اور کہاں حاصل رہا ہے؟ یہود کی نفس اقبال مندی میں شبہ ذرا نہیں۔ بڑے سے بڑے ملک و سلطان اس قوم میں ہوئے ہیں۔ بڑے سے بڑے ساہوکار اور سرمایہ دار اس میں گزرے ہیں۔ سوال اس کا نہیں، سوال اس قوم کے سب سے بڑھ چڑھ کر ہونے کی بابت ہے۔

کیا ایسے با اقبال افراد اس قوم میں ہوئے ہیں ؟ دوسری ترقی یافتہ قوموں میں نہیں ہوئے ہیں ؟ سوال اس قوم کے بے نظیر ہونے کی بابت ہے ۔ قرآن نے جو صراحت کے ساتھ انھیں افضل و برترین اقوامِ عالم کہہ دیا ہے تو ثبوت بیسویں صدی عیسوی کا طالب علم قرآن کے اس دعوے کا مانگتا ہے، اور نشان دہی متعین ملک و زمانہ کی چاہتا ہے ۔

جواب سے پہلے دو تاریخی حقیقتیں ذہن نشین کر لیجیے اور جواب بالکل سہل ہو کر سامنے خود بخود آ جائے گا ۔

پہلی بات یہ کہ بنی اسرائیل کوئی مذہبی اصطلاح نہیں، یہ ایک نسلی نام ہے ۔ اس قوم کا لقب، جو یعقوب معروف بہ اسرائیل بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی نسل سے پیدا ہوئی ۔ اور اپنے وطن شام سے نکل کر پھر اطرافِ عالم میں پھیلی ۔ ظہورِ اسلام اور بعثت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں نبوت و رسالت جہاں کہیں بھی تھی نسلی و قومی ہی تھی ۔ آفاقی اور تمام تر اعتقادی تو دنیا میں پہلی بار ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے ہوئی ہے ۔ خاندان یعقوبؑ کی اصل فضیلت یہ تھی کہ جہاں اسے عزت و حکومت سے نوازا گیا، وہیں اس کے اندر انبیاء بھی پیدا ہوئے اور اسے شرفِ رسالت سے بھی مشرف کیا گیا ۔ وَجَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ (مائدہ ۵ آیت ۲۰)، اس معنی پر دال ہے ۔

دوسری بات یہ کہ دنیوی سروری اور سرداری، ملک گیری اور ملک داری کے انعام میں، ایران و ہند، عراق و چین، یونان و مصر کے بہت سے افراد شریک و سہیم رہے ہیں لیکن شرک و مخلوق پرستی کی آلائش سے ان میں سے کوئی بھی قوم محفوظ و مستثنیٰ نہ رہی ۔ آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی، انجم پرستی، مورتی پوجا وغیرہ ہر ملک میں ایک ضمیمہ علوم و فنون تہذیب و شائستگی کا بنے رہے اور دیوتا، اوتار، بلکہ انگریزی اصطلاح میں ہیرو گاڈ (Hero God) کا عقیدہ تقریباً ہر مذہب یا دھرم کا جزو لاینفک رہا کیا ہے ۔

اور تاریخ کے دور میں صرف ایک ہی قوم عقیدۂ توحید کی علم بردار رہی، اور خالص خدا پرستی کی تلقین کرتی رہی ۔

قرآن نے جس انعام خصوصی کا ذکر اس قوم کے سلسلہ میں بار بار کیا ہے اور اس میں اس کا شریک و سہیم کسی دوسری قوم کو نہیں گردانا ہے، وہ یہی نعمت توحید ہے، اور بار بار اس امتیاز خصوصی کا ذکر کر کے اس ناشکر گذار قوم کو جتایا ہے کہ صدیوں تک اس نعمت خاص کی بارش تمہارے اوپر ہوتی رہی، تم ہی کو اس دعوت کا نقیب، پشتہا پشت تک رکھا گیا ہے ۔ اور اب بالآخر اتمام حجت کے بعد تمہارے مسلسل کفرانِ نعمت کی پاداش میں یہ نعمت تمہارے خاندان و نسل سے سلب کی جاتی ہے ۔ اور دین توحید آج سے بجائے نسلی یا قومی مذہب کے، ایک اسمٰعیلی پیمبر کے واسطے سے دین انسانی یا عمومی کیا جاتا ہے ۔ ہر نسل و قوم کے لئے جو بھی صحیح عقیدہ کا اتباع کرے اور توحید و رسالت کا قائل ہو جائے ۔ اِنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ کے اس صحیح مفہوم پر جس کسی کی نظر پہونچ جائے گی، اس کا بجائے کسی شک و اشتباہ کے، قرآن کی تاریخیت پر ایمان کس قدر مستحکم تر ہو جائے گا!

ہمارے جو مفسرین یہود اور بنی اسرائیل کو مرادف سمجھے ان کے ہاں ایک سوال امت موسوی اور اُمت محمدی کے درمیان تفاضل کا پیدا ہو گیا ہے، حالانکہ دونوں کے مفہوم کا فرق اگر واضح رہے، تو سرے سے تقابل و تفاضل کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے ۔ امتِ محمدی ظاہر ہے کہ نام کسی نسل یا قوم کا نہیں بلکہ وہ تو ایک خاص عقیدہ کے ماننے والوں کا نام ہے، خواہ وہ کہیں کے باشندے ہوں اور کوئی سا بھی نسب رکھتے ہوں ۔

۴

اسی رکوع میں ذرا آگے چل کر آیت پچاس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے

یہ الفاظ ملتے ہیں:

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ
فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے سمندر پھاڑ دیا، پھر ہم نے تم کو بچالیا اور فرعون والوں کو غرق کر دیا تھا اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے"۔

سوال آج کے قاری کے دل میں قدرتاً یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ کہاں کا ہے؟ اور کب کا ہے؟ ہمارے بھولے بھالے مفسرین جو جغرافیہ کے مبادی سے بھی واقف نہیں تھے اور ان کے کانوں میں نام صرف دریائے نیل کا پڑا ہوا تھا، قدرتاً یہی سمجھے کہ وہ دریا دریائے نیل ہی ہوگا —— یہ قیاس تمام تر ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ بنی اسرائیل جس شہر میں آباد تھے، اس کا نام توریت میں جُشن (GOSCHAN) آیا ہے۔ اسرائیلیوں کو یہاں سے شام کی طرف آنا تھا، جو اس شہر سے شمال و مشرق میں واقع تھا۔ نیل پر ان کے جا پہنچنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، سوا اس کے کہ راستہ اس وقت بالکل ہی اُلٹا اختیار کیا ہو، شام و فلسطین تو شمال مشرق میں تھے۔ بنی اسرائیل اسی سمت چلے لیکن بجائے اس کے کہ شمال میں ابھی کچھ اور چلے جاتے پہلے ہی مشرق کو مڑ گئے، اور جنوب میں بحر قلزم کی اس شاخ سے مڈبھیڑ ہو گئی، جو ایک دوشاخہ کی صورت میں کوئی دو میل کے عرض میں سمندر کے بائیں طرف واقع ہے، اور جسے موجودہ نقشہ میں خلیج سویز کہتے ہیں۔

بعض مغربی روایتوں میں یہ آیا ہے کہ یہ ہجرت اسرائیل تمام تر ایک ہی مرتبہ نہیں ہوئی بلکہ مختلف چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہجرت کرتی رہتی تھیں۔ یہ روایتیں اگر کبھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیں تو اس وقت اس پر روشنی قرآن مجید کے لفظ نَجَّيْنَا سے پڑے گی جو باب تفعیل سے ہے، اور جس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ فعل کا بتدریج ہونا دکھاتا ہے

اس خروج یا ہجرت کے وقت راستوں پر لیمپ، لالٹین وغیرہ کی روشنی کہاں تھی،

بلکہ آج کل کی سیدھی ہموار پختہ سڑکیں بھی موجود نہ تھیں اور یہ عجلت اور گھبراہٹ اس پر مستزاد کہ راتی راتا ہی حدود مصر کو پار کر لیں۔ شب کی تاریکی میں اگر اسرائیل راہ بھول گئے ہوں تو تعجب اس پر ذرا نہ کیجئے۔ فرعون کو خبر ہو گئی اور وہ خود اپنی کمان میں لشکر جرار لے کر تعاقب کو چڑھ دوڑا۔ زمانہ کا تعین جزم کے ساتھ مشکل ہی ہے تاہم اکثر محققین کا رجحان پندرھویں قبل مسیح کے وسط کی جانب ہے بلکہ بعض مثلاً سر چارلس مارسٹن نے تو جرأت کر کے سنہ بھی متعین کر دیا ؁۱۴۴۷ قبل مسیح۔

۵

تاریخ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قرآن مجید تذکرہ تو بہت سے واقعات کا کر گیا ہے کہیں صراحتاً اور کہیں اشارتاً، لیکن کم سے کم ایک واقعہ ایسا ہے جس کے لئے ذہن میں ضرور کرید پیدا ہوتی ہے، ارشاد ہو رہا ہے بنی اسرائیل ہی سے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا
لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ۝ (آیت ۶۵

”تم خوب جانتے ہو ان لوگوں کو اپنے میں سے جنہوں نے سبت کے بارے میں حدود سے تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ“۔

عَلِمْتُمْ کے معنی خود ہی یہ ہیں کہ مخاطبین کے سامنے ان کے کسی جانے بوجھے واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے اور اس پر لَ حرف قسم تاکید اور قد حرف تاکید کا مزید اضافہ۔ گویا تاریخ اسرائیل کا کوئی خوب ہی معروف و متعارف واقعہ جس سے موجود الوقت اسرائیل کو مجال انکار نہیں۔ سبت یا ہفتہ کا دن ان کے ہاں بہت محترم تھا اور احترام سبت کے احکام ان کے ہاں نہایت درجہ تاکیدی تھے۔ ذکر لامحالہ کسی ایسے واقعہ کا ہو رہا ہے جو سبت شکنی کرنے والوں اور احکام سبت کی بےحرمتی

کرنے والوں پر بطورِ سزا کے نازل ہوا تھا، اور پھر مدتوں ان کی قوم میں یہ بطور عبرت و موعظت زبان زدِ عام رہا۔ گُرید یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایسا اہم واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ مجاہد کوئی معمولی اور متاخر شخص نہیں، تابعی ہوئے ہیں۔ اور تابعی بھی ایک ممتاز درجہ رکھنے والے۔ ترجمان القرآن۔ ان سے یہ قول ابن جریر وغیرہ میں منقول چلا آرہا ہے کہ انسانوں کا یہ مسخ صورتًا اور جسمًا نہیں ہوا بلکہ محض سیرت و کردار، عادات و خصائل کے لحاظ سے وہ ذلیل بندر بنائے گئے جیسا کہ قرآن ہی میں سورۃ الجمعہ میں یہود ہی کو گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کَمَثَلِ الْحِمَارِ۔ اور راغب کے مفردات القرآن میں بھی ایک قول اسی معنی میں نقل ہوا ہے ______ اس مفہوم کو تسلیم کر کے قدرتًا واقعہ کا استبعاد از خود رفع ہو جاتا ہے اور ذہن کو کوئی خاص حیرانی نہیں رہ جاتی۔ پھر بھی کب کہاں کے سوال کسی درجہ میں تو باقی ہی رہ جاتے ہیں۔

ان دونوں سوالوں کا جواب ثقہ اور سنجیدہ اسلامی روایتوں میں ملتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے زمانہ کا ہے اور آپ کا زمانہ جدید تحقیق کے مطابق ۱۰۱۳ سے لے کر ۹۷۳ ق۔م تک رہا ہے اور مقام کا نام جس کا پتہ قرآن نے حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کہہ کر سورۃ الاعراف میں دے دیا ہے یعنی ساحل سمندر پر ایلہ آیا ہے۔ توریت میں اس کا نام ایلات (Elath.) صحیفہ (استثناء باب دوم آیت ۸) اور موجودہ جغرافیہ میں اس کا نام خلیج عقبہ کا مشہور بندرگاہ عقبہ ہے۔

۶

ایک بڑے اچنبھے میں مسلمان کو ڈالنے والا مقام قرآن میں وہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کی صفائی کفر سے پیش کی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے، کہ:۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (رکوع ۱۲، آیت ۱۰۲)

"سلیمان نے تو کبھی کفر نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کرتے تھے"۔

مسلمان کو قدرتاً یہ پڑھ کر کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ سلیمانؑ جب پیغمبر برحق تھے تو یہ کہنے والی کون سی بات تھی کہ آپ کفر کے مرتکب نہیں ہوئے۔ کفر کر کے کوئی مومن ہی کب باقی رہ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ پیمبر اس کا ارتکاب کر سکے! دل کی کھٹک بجا ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک یہ نہ سُن لیا جائے کہ دو دو بڑے اور صاحبِ کتاب مذہبوں نے آپ کو اپنی کتاب میں نعوذ باللہ دینِ توحید سے مرتد اور بے دین قرار دیا ہے۔ عہدِ عتیق کے صحیفہ ۱۔ سلاطین کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا" (باب ۱۱، آیت ۴، ۶)

اور اسی صحیفہ کی دو تین آیتیں اور بھی:۔

"سو از بسکہ اس کا دل خداوند کی طرف سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضب ناک ہوا، کہ اس نے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پھر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا"۔ (سلاطین: ۱۱، ۹، ۱۰)

یہ اور بات ہے کہ محققین جدید کی تحقیقات بھی بائبل سے کہیں زیادہ قرآن کی تائید میں آ رہی ہیں اور ان کے اصل حوالے خاکسار کی تفسیر میں درج ہو چکے ہیں۔

ضمناً قرآن مجید نے یہ بھی بتا دیا کہ ساحرانہ اور کافرانہ حرکتیں آپ کے عہد میں تو شیاطین جن و انس ہی کرتے تھے، اور انھیں منسوب آپ کی جانب کر دیتے تھے۔ قرآن مجید میں یہاں لفظ شیاطین بصیغۂ جمع آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ابلیس تو ہو نہیں سکتا۔ لامحالہ شیطان مجازی ہی مراد ہوں گے۔ یعنی شیطان صفت انسان یا جنات، جو طرح طرح کی شیطانی حرکتیں کرتے رہتے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلاتے رہتے تھے۔

سحر و کہانت، ٹونے ٹوٹکوں، نقش و گنڈوں کا زور جو یہود کے ہاں رہا ہے اس سے

اُن کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ قرآن مجید اس کی تصدیق کیوں کرتا ہے؛

یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ: "لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے"۔ اور اس سے معًا پیشتر ہے:

وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا (کفر تو شیطان کرتے تھے) اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ کفر تو شیطان کرتے تھے اور وہی لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن ایک دوسری ترکیب یہ بھی جائز سمجھی گئی ہے کہ فاعل بجائے شیطان کے یہود کو قرار دیا جائے یعنی اس فقرۂ قرآنی کو جو ذرا پہلے آچکا ہے، فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کو۔ عملاً نتیجہ اس صورت میں بھی وہی نکلتا ہے، یعنی عہد سلیمانی کے شیطان صفت یہود سحر آموزی اور سحر کے چرچے میں مشغول تھے۔

ان تصریحات کے معًا بعد قرآن مجید میں ہے:

وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (ع ۱۲، آیہ نمبر ۲)

"اور وہ پیچھے لگ گئے اس (علم) کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُتارا گیا تھا۔"

بابل جس ملک کا نام ہے اس کو اب عراق عرب کہتے ہیں اور اسی کا ایک قدیم نام کلدانہ یا کلدانیہ بھی ہے۔ اس کی شہرت علوم سحریہ میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ انگریزی میں کالڈین مرادف ہی ساحر کا ہو گیا ہے، اور دو فقروں کے عطف سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر فلسطینی اور سحر بابلی کا عروج ایک ہی زمانہ میں رہا ہو، بلکہ بیان و سباقِ قرآنی میں صاف گنجائش اس کی موجود ہے کہ دونوں ملکوں کے عروجِ سحر کا زمانہ الگ الگ ہو لیکن یہود کی مہارت سحر دونوں قسم کے سحر میں مشترک رہی ہے۔

اور وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ میں لفظ اُنْزِلَ سے کسی کو دھوکا نہ ہو، کہ یہ شرف و تعظیم کا لفظ سحر کی سی حرام چیز کے لئے کیسے لایا گیا۔ "نزول" و "انزال"

عربی میں موقع شرف و تعظیم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تکوینی حیثیت سے جو شے بھی اللہ کے ہاں سے اور فرشتوں کے واسطے سے آتی ہے، سب پر اطلاق، عام اس سے کہ وہ خیر ہو یا شر، نزول و انزال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ فعل رزق (روزی) کے ساتھ آیا ہے، اور ماء (پانی) کے ساتھ، اور اَنعام (چوپایوں) کے ساتھ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رجز (عذاب یا بلاء) کے ساتھ بھی۔ سورۂ عنکبوت کی آیت ۳۴ میں

اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ ——— اور

ایک سحر ہی پر کیا موقوف ہے، کائنات میں نور و ظلمت، خیر و شر، حق و باطل، طاعت و معصیت میں سے جو کچھ بھی موجود ہے سب کا وجود تکوینی حیثیت سے مسبب الاسباب ہی کے نازل کرنے سے تو ہوا ہے۔ اور سحر کے لئے یہاں انزال اپنے اسی وسیع معنی میں آیا ہے یعنی یہ بات ان کے دل میں ڈال دی گئی، کوئی اظہارِ شرف و تکریم مقصود نہیں۔ اسی طرح کوئی حیرت فرشتوں کے ذکر پر بھی نہ کیجئے، ایک سحر کیا معنی، کفر و شرک، کوئی گندہ سے گندہ کام بھی تکوینیات کے سلسلہ میں ہو، آخر فرشتوں ہی کے واسطہ یا وسیلہ سے تو لیا جاتا ہے اور یہ امر فرشتوں کی برگزیدگی و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں۔

بابل والوں کے سحر پر علاوہ تاریخی شہادتوں کے گواہی خود عہد عتیق کی موجود ہے چنانچہ صحیفۂ دانیال (باب ۴، آیت ۳) اور صحیفۂ مکاشفہ (باب ۱۰، آیت ۵ اور باب ۱۸، آیت ۳۰) وغیرہ میں صراحتیں درج ہیں۔ اور ایک جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلدانیوں کی فرد جرم کا سر عنوان یہی جرم سحر کاری تھا۔ صحیفۂ مکاشفہ میں ہے:

> "تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے، تیری جادوگری سے ساری قومیں گمراہ ہو گئیں اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا۔" (باب ۱۸، آیت ۲۳، ۲۴)

قرآن مجید میں یہ سارا تذکرہ اس تاریخ اسرائیل کے ضمن میں لایا گیا ہے اور گویا یہود عرب پر

حجت قائم ہو رہی ہے کہ سحر و کہانت کی پلیدی سے تولد ہوئے ہو اور تاریخ کا کوئی سا دَور رہو، یا زمین کا کوئی سا قطعہ ہو، فلسطین ہو یا بابل، تمھارے ہاتھ تو برابر اس جُرم سے رنگین رہے ہیں ۔

مَلَکَیْنِ (بالفتح) کی ایک قرات اگرچہ مَلِکَیْنِ بھی ہے کسرۂ لام کے ساتھ اور اس بنا پر اہلِ تفسیر کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ دونوں اصلاً فرشتے نہ تھے بلکہ بشر تھے اور بادشاہ ۔ اور انھیں جو دوسری روایتوں میں فرشتہ کہا گیا ہے تو صفاتی حیثیت سے ۔ یعنی ان ملکوتی صفات کی بنا پر ۔ لیکن جمہور کا قول اس قرات مشہور کی بنا پر ان کے فرشتے ہی ہونے کا ہے ۔ اور کسی خاص تشریعی مصلحت سے کسی خاص موقع پر اور کبھی امر و نہی ہی کی تنقیح و تحقیق کی غرض سے، کسی فرشتہ کو انسانوں کے درمیان رہنے سہنے کے لیے بشری جذبات و خصائل سے موصوف کر کے بھیج دیا گیا تو اس سے کوئی بھی قباحت لازم نہیں آتی۔ خصوصاً جب کہ مقصود ہی سحر و کہانت کا ابطال و استیصال ہو۔ آخر دنیوی حکومتوں میں تو روزمرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مجرموں کی سراغ رسی اور گرفتاری میں، اور جرائم کے قلع و قمع کی خاطر، پولیس کانسٹبلوں ہی کو نہیں، بڑے بڑے سرکاری افسروں کو بھی کیسے کیسے طریقے مجرموں ہی کے سیکھنے پڑتے ہیں اور خود کیسے کیسے مصنوعی اور نقلی جرائم کا ارتکاب کرنا ہوتا ہے۔ بات ردِ کفرِ سلیمانؑ سے شروع ہوئی تھی اور پھر بات میں بات نکلتی آئی، یہاں تک کہ بہت سی اُلجھنیں ایک ہی سلسلہ کی صاف ہو گئیں ۔

* * *

اسی قصۂ سلیمانی کے ضمن میں اور گویا محض اتفاقیہ اور لپیٹ میں، قرآن، اسرائیلیوں کی ایک اور بھی خصوصیت بیان کر گیا ہے اور وہ بھی سننے کے لائق ہے ۔

یہ فرشتے سحر کے گُر کسی کو بلا ضرورت بتاتے ہی نہ تھے، اور جب ضرورتاً بیان کرتے

24719

بھی تو یہ ضرور تنبیہ کر دیتے کہ ہم تو امتحان کے لئے بھیجے گئے ہیں، تم کہیں واقعۃً اور عقیدۃً سحر کو نہ اختیار کر لینا، ورنہ اس طرح کافر ہو جاؤ گے۔

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (رکوع ۱۲، آیت ۱۰۲)

"اور وہ دونوں کسی کو بھی فن کی باتیں نہ بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم لوگ تو بس ایک ذریعۂ امتحان ہیں، تو کہیں تم کفر نہ اختیار کر بیٹھنا۔

"تعلیم" یہاں باقاعدہ درس دینے کے مفہوم میں نہیں، محض اطلاع یعنی جتلانے جتانے، بتانے کے معنی میں (جیسا کہ صاحب معالم التنزیل و صاحب بحر المحیط وغیرہ نے کہا ہے) خود ایک قرآنی قراءتِ متواتر میں بھی تخفیف لام کے ساتھ و مصدر اعلام سے آئی ہے۔

لیکن اس شدید و صریح انتباہی ہدایت کے باوجود بھی ایک خاص قسم کے نقش اور گنڈے یعنی میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دینے والے یہ لوگ ضرور ان سے سیکھ لیتے۔

ارشاد ہوتا ہے:-

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (رکوع ۱۲-آیت ۱۰۲)

"مگر لوگ ان سے سحر سیکھ لیتے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد اور اس کی زوجہ کے"۔

قرآن مجید کو آخر اس مخصوص نوعیت کے جھاڑ پھونک کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے جواب میں عرب کے ایک امی کے لائے ہوئے کلام کو نہیں، بلکہ یہ دیکھیے کہ بیسویں صدی کے آغاز کے علماء یہود اور محققین اسرائیل اپنے اسلاف و اجداد کے مشغلۂ سحر و ساحری اور اعمال سفلیہ سے متعلق کیا کہتے ہیں، بگوش ہوش سماعت فرمائیے:-

"سحر کی سب سے زیادہ عام و متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لئے دیا جاتا تھا۔ خاص کردہ نقش جو ناجائز آشناؤں کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر بھی سحر اور حرام کاری کا ساتھ ہی ساتھ آیا ہے۔"

یہ حوالہ ہے جیوش انسائیکلوپیڈیا کی جلد ۸، صفحہ ۲۵۵، کالم اول کا۔

(۸)

پارۂ اول کے ثلث کے بعد حکمِ استقبالِ قبلہ کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ ابھی تک کوئی حکمِ قبلہ قرآن مجید میں نازل نہیں ہوا تھا۔ عام اہلِ مذہب اپنے اپنے خدا کو مجسّم اور کسی سمت کے ساتھ مقید، اور کسی مکان کے ساتھ مخصوص و محدود مانتے تھے اور خدا کے تلبّس سے اس خاص سمت کو بھی مقدس ماننے لگے تھے۔ قرآن مجید میں جو پہلا ارشاد اس بارے میں وارد ہوا ہے، اس میں سب سے پہلے اس غلط تصوّر کی اصلاح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ق فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط
اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥ (رکوع ۱۴۔ آیت ۱۲۰)

"اللہ ہی کا مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، سو تم جدھر کو بھی منہ پھیر دو بس ادھر ہی اللہ کی ذات ہے۔ بیشک اللہ بڑا وسعت والا، بڑا علم والا ہے۔"

یعنی کیا بحیثیت مخلوق، کیا بحیثیت مملوک، کیا بحیثیت مربوب، ساری سمتیں یکساں اور ہم مرتبہ ہیں، کسی میں کوئی جلوۂ تقدیس، کوئی شائبۂ الوہیت موجود نہیں، جس طرف بھی نظر پھیرو گے اللہ ہی کے انوار نظر آئیں گے۔

اُس خدائے واحد کی ذات ہر مکان، ہر ظرف کی محدودیت سے پاک اور ہر سمت و جہت سے منزہ ہے، اس کی تجلیات ہر رُخ پر یکساں پاؤ گے۔ البتہ جو اُمت اب آفاقی

اور عالمگیر پیدا کی جا رہی ہے، اس میں مرکزیت اور یک جہتی کی خاطر کوئی قبلہ نما بنا دیا جائے گا۔ وہ ذاتِ لامحدود و بے پایاں تو خود ہی ہر ظرف، ہر مکان کو اپنے اندر لئے ہوئے، گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی سمائی بھلا کس ظرف و مکان میں ہو سکتی ہے؟ ہاں! وہ لامکان اور ماوراء الظرف اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے اس موحّدِ اُمت کے لئے دعا و عبادت کی غرض سے جو بھی قبلہ، جو بھی نقطۂ مرکزیت چاہے مقرر کر دے۔ اس میں دخل کسی سمت کی ذاتی قدوسیت کو ذرا بھی نہیں۔

زمین استقبالِ کعبہ کے لئے قرآن نے اس آیت میں تیار کر دی۔ کعبہ رخی اور مسائلِ متعلقہ پر معروضات آگے سنئے گا۔

۹

معاً بعد جو آیت آتی ہے اُس میں ذکر مسیحی شرکِ عیسیٰ مسیح کی فرزندئی رب کا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ (آیت ۱۱۱، رکوع ۱۴)

اور نصرانیوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ پاک ہے وہ! اصل یہ ہے کہ اس کی مِلک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُسی کے فرمانبردار ہیں"۔

یہ کیسی صریح حماقت ہے کہ اللہ سے اس کی کسی بھی مخلوق کا رشتہ اِبنیت یا تبنیت کا قائم کیا جائے۔ سب اس کی مشیتِ تقدیری و تکوینی کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ آیت میں جو لفظ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ہے، اس کا ترجمہ ہے کہ "اللہ نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اس کے بیٹا ہے نہیں، بلکہ بیٹا بنا لیا ہے یا عوامی محاورہ میں گود لے لیا ہے"! عرب کے ایک اُمی کے سنائے اور چلائے ہوئے لفظ خیال میں رکھئے، اور پھر ایک سرسری نظر، مسیحی ضلالتوں

کی مرتب کی ہوئی "تاریخ مسیحیت" پر کرلیجئے ۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک بڑا فرقہ ان میں ملتا ہے ADOPTIONISTS اتخاذیین کے نام سے ۔ اس کا مرکزی عقیدہ یہ نہیں کہ مسیح خدا کا جنا ہوا، پیدائشی بیٹا ہے، بلکہ گویا خدا نے کامل و مکمل انسان کو اپنا متبنّیٰ کرلیا ہے ۔ اور اسی عقیدہ کی شرح یہ ہے کہ مسیح نہ خلقۃً خدا ہیں نہ وہ شروع سے بنے بنائے ترشے ترشائے خدا پیدا ہوئے ۔ وہ اصلاً بشر ہی تھے ۔ البتہ اقنوم ثالث یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع سے پڑنے لگا اور ان سے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال پر پہنچ گئے کہ اقنوم اول، خدائے برتر و اعظم نے انھیں اپنی ابنیت میں لے لیا اور شریک الوہیت کرلیا ۔ اور اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ سارے صفاتِ الٰہی میں شریک و سہیم ہیں ۔ آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اس عقیدہ کو الحاد و زندقہ قرار دیا ۔ اور بارھویں صدی عیسوی میں اس فرقہ نے پھر زور پکڑا —— ہمارے مسلمان مفسرین اور خادمانِ قرآن سے اگر کہیں کوئی چوک مطالعۂ مسیحیت کے دقائق میں رہ گئی ہو تو اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور؟ آخر وہ قرآن کی ہمہ دانی، ہمہ گیری کہاں سے لاتے؟

١٠

تاریخ بنی اسرائیل کے اہم عنوانات گنا کر سولھویں رکوع کے شروع میں پھر وہی مضمون دہرایا ہے، جو اسی تاریخ کے سلسلہ میں چھٹے رکوع میں ارشاد ہوا تھا۔

يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ
وَاَنِّيۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ (آیت ۱۱۷، رکوع ۱۵)

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تمھیں بخشی تھیں اور یہ کہ میں نے تمھیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی تھی ۔

گویا یہاں خاتمہ پر دو باتوں کی طرف اشارہ کردیا۔

ایک یہ کہ جب تک نسلی و قومی نبوتوں اور رسالتوں کا دستور قائم رہا، سب سے برگزیدہ اور مقبول قوم اسرائیل ہی کی رہی۔ کسی دوسری قوم کو بہ حیثیت قوم موحّد ہونے کا شرف حاصل نہ تھا۔

دوسری بات یہ کہ خدائی مہربانی کوئی ایسی شے نہیں ہوتی، کہ کسی قوم پر بہر حال و بہر صورت چپکی رہے، یہ مشروط ہوتی ہے۔ بندے جب تک ادائے شکر کرتے رہتے ہیں، نعمتیں اور انعام اُن پر قائم رہتے ہیں، لیکن جب اس کے بجائے ناشکری اور نافرمانی مسلسل ہونے لگتی ہے اور اپنے ہی پیمبروں سے سرکشی و بغاوت حد سے بڑھ جاتی ہے، تو بالآخر وہ نعمتیں سلب بھی ہو جاتی ہیں اور وہ انعام پائے ہوئے اب محروم رہ جاتے ہیں۔

یہ گہری اور مستقل حقیقتیں ہیں ہر موقع پر کام آنے والی۔

۱۱

اس کے بعد ذکر حضرت ابراہیمؑ کا شروع ہوتا ہے اور اس ذکر کے بعد کہ آپؑ کا امتحان بعض چیزوں میں لیا گیا اور آپ جب خدائی امتحان میں پورے اُترے تو آپ کو انعام یہ ملا کہ دنیا کی امامت آپ کے سپرد کی گئی۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط (رکوع ۱۵۔ آیت ۱۹)

"اللہ نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں"۔

اور امامت سے مراد اصطلاح قرآنی میں، سلطنت و حکومت، جاہ و مال نہیں بلکہ دینی و روحانی پیشوائی ہے۔ اور توریت میں بھی یہ وعدۂ انعامِ الٰہی دُہرایا گیا ہے گو قرآن کا جامع و بلیغ لفظ "امام"، اُس میں موجود نہیں۔ صحیفۂ پیدائش میں ہے:۔

"اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا، اور تو ایک برکت ہو گا، اور ان کو جو تجھے برکت دیں برکت دوں گا،

اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کر دوں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے"۔ (باب ۱۲، آیت ۱ و ۲)

یہ وہی امامت ہے جو آج تک ابراہیمؑ کے حصہ میں چلی آرہی ہے، اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں، یعنی یہودیت اور نصرانیت، وہ آپ کی امامت مسلّم رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک نامور فرنگی فاضل آپ کا تعارف اِن سائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بیسویں صدی عیسوی کے ثلث کے خاتمہ پر یوں کرتا ہے:

"ابراہیمؑ کی ہستی کسی یہودی سردار کی نہ تھی، جو لوٹ مار کرتے یا ملک گیری کرتے رہتے۔ ان کی اصل اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے۔ وہ حقیقتاً مورثِ اعلیٰ کسی نسل کے نہیں بلکہ بانی و امام مذہبی تحریک کے تھے۔ محمدؐ کی طرح جو اُن کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔ وہ ساری قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت اور توریت کے حسب روایت اسرائیلی مذہب کے بانی تھے" (طبع چہاردہم، جلد اول صـ۶)

جن لفظوں کو میں نے اس مجلس میں زور دے کر پڑھا ہے، انھیں ایک بار پھر سُن لیجئے: "محمدؐ کی طرح وہ بھی قوموں اور قبیلوں کے رہنما تھے"۔ اللہ کے خلیل اور اللہ کے حبیبؐ کے درمیان یہ مماثلت کا اعتراف، یورپ کی زبان سے، بس اللہ ہی کی شان ہے!

ابراہیم خلیل باوجود مرتبۂ خلت، بہر حال انسانی دل و جگر اور بشری جذبات رکھتے تھے، یہ مژدۂ عظیم پا، باغ باغ ہو گئے، اور فرطِ مسرت سے وہ جھٹ سے بول اُٹھے وَمِنْ ذُرِّيَّتِي؟ اور میری نسل بھی اس امامت میں حصہ دار ہو گی نہ؟ ذُرّیت کے معنی اولاد ہی نہیں، بلکہ اولاد در اولاد بھی۔ گویا اس میں آپ کا سارا سلسلۂ نسل آگیا، شاخ اسرائیلی، شاخ اسمٰعیلی دونوں کو شامل۔ اور قرآن نے اسرائیلیوں کے اس دعوی کی جڑ ہی کاٹ دی کہ ابراہیمؑ سے جو وعدے ہوئے، وہ انھیں کی شاخ اسرائیلی کے ساتھ مخصوص محدود تھے!

ضمناً روشنی اس پر بھی پڑ گئی کہ وعدۂ انعام و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کر لینے کی تمنا نہ صرف امر طبعی ہے، بلکہ سنتِ انبیاء بھی!

بہرحال آپ کی دعا کا جواب، قرآن کے بلیغ ایجاز میں یہ ملا کہ:

لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ (آیت ۱۲۴) "میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا"

یعنی فضل و برکت کا سلسلہ تمہاری نسل میں ضرور جاری رہے گا، لیکن اس کے تحقق کے لئے محض ارث نسل و نسب کافی نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح بھی ضروری ہیں۔

الظّٰلِمِیْن کے لفظ کا خوب خیال رکھیئے، کافر تو اس میں کھلے ہوئے داخل ہیں لیکن اہلِ علم کے ایک گروہ نے اس سے مراد فاسق بھی لئے ہیں۔ اور مرشد تھانویؒ نے اس سے یہ استنباط تو بہت ہی خوب کیا ہے کہ "اختیاری بدعملی کے ساتھ فضلِ خداوندی اور انعام الٰہی جمع نہیں ہو سکتے"۔

یہ تماشہ بھی عجیب ہے کہ بائبل کی تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اُکتا کر بعض روشن خیال فرنگیوں نے انیسویں صدی کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کی تاریخیت ہی سے انکار کر دیا اور یہ کہنے لگے کہ یہ شخصی نام نہیں بلکہ اسم جنس تھا، یعنی شیخ قبیلہ کا لقب۔ لیکن کچھ ہی دن بعد پھر تحقیق کا رُخ بدلا اور بیسویں صدی کا ثلث اول ہی ختم ہو رہا تھا کہ ایک بار پھر ابراہیم خلیلؑ کی تاریخی حیثیت مسلّم ہو گئی

۱۴

آیت ۱۱۵، ابھی کچھ ہی دیر پہلے گزر چکی ہے، لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ اب تحویل قبلہ کا حکم جب صراحت سے نازل ہونے کو ہے، تو پھر اس طرح کی چہ میگوئیاں اہلِ کتاب، خصوصاً یہود میں شروع ہوئیں، حالانکہ اب تک جو نماز کا قبلہ بیت المقدس بنا ہوا تھا یہ مبنی کسی قرآنی حکم پر نہ تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء بنی اسرائیل کا یہ قبلہ

پنا بھی محض اجتہاداً بنالیا تھا، اور اب قیام مکہ ختم ہونے اور ہجرت مدینہ اختیار کرنے پر، کچھ زمانہ کے بعد قبلہ نصِ قرآنی سے مقرر ہونے کو تھا کہ اس پر قیل وقال شروع ہوگئی اور قرآن کے بیان سے معلوم ہوا کہ زبانیں کس طرح چلنا شروع ہوئیں :۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي
كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي
مَنْ يَّشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○ (رکوع ۱۷، آیت ۱۴۲)

”یہ بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو اُن کے اس قبلہ سے ہٹا دیا ہے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب دونوں اللہ ہی کی ملک ہیں اور وہ جسے چاہتا ہے چلاتا ہے سیدھی راہ پر۔“

کٹھ حجتے اور نافہم لوگ پھر وہی قضیہ سمت کا نکال رہے ہیں، اور بحث مشرق اور مغرب کی شروع کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسی سمت سے اور نئے پُرانے قبلہ سے کیا ہوتا ہے حکیم مطلق جن مصلحتوں اور حکمتوں سے بھی چاہے جس مکان کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے وہی سیدھی راہ کا اتباع ہوگا، اس کے کام میں چون وچرا تو وہی لوگ کریں گے جو سفیہ ہوں گے جو عقل کے کورے، فہم کے ناقص۔ افسوس ہے کہ مفسرین خود سمت و جہت کی بحث میں پڑ گئے قرآن نے اصل اعتراض ہی پر تو اعتراض کیا تھا اور اس پر بحث ہی کو سرے سے باطل ٹھہرایا تھا۔

۱۳

اور مابعد جو حکم نماز کے وقت رُخ کرنے کا ملتا ہے وہ کسی جہت یا سمت کی جانب نہیں بلکہ ایک مخصوص مکان اور متعین عمارت کی بابت ملتا ہے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط (آیت ۱۴۴)

آپ اپنا منہ پھیر لیا کیجئے مسجد حرام کی طرف۔

اور معلوم و معروف ہے کہ مسجد الحرام نام ہے مسجد حرم شریف یا خانۂ کعبہ والی مسجد کا ایک معروف و متعین عمارت کا۔ اور قرآن نے یہ حکم صادر کرکے یہ بھی جتا دیا کہ یہ منکرین اہلِ کتاب اس حکم تحویل قبلہ کی طرف سے کسی اشتباہ و مغالطہ میں نہ رہیں اور انھیں بتا دیا گیا تھا کہ قبلۂ ابراہیمی اس اُمت کا بھی قبلہ ہوگا۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (آیت ۱۴۴)

”اور یہ لوگ کتاب پا چکے ہیں وہ یقیناً اسے بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ حکم بھی ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے۔“

اور یہ لوگ ایک اسی حکم کو کیا، ہمارے ان رسول کو بھی خوب ہی پہچانتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے خود اپنی قوم والوں کو خوب پہچانتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (آیت ۱۴۶)

اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ ان کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے نسل والوں کو۔

یعرفون میں ضمیر ہٗ سے کیا مراد ہے؟ اگرچہ اگلوں میں اکثر نے اس سے مراد یہی حکم تحویل قبلہ لیا ہے یعنی اہل کتاب مسجد حرام کو بھی بہ حیثیت قبلۃ الانبیاء کے خوب جانتے ہیں، لیکن بعد کو اکثر اہلِ تفسیر کا اس پر اتفاق ہوگیا کہ اشارہ ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے اور آنحضورؐ کی اتنی علامتیں ان کے ہاں منقول ہیں کہ اب اُنھیں اس بارے میں کوئی اشتباہ نہیں رہ سکتا، اہم ترین لفظ آیت میں اَبْنَآءَهُمْ لفظی معنی اپنے لڑکوں کے ہیں لیکن اَبْنَآءَهُمْ صیغۂ جمع سے مراد فرداً فرداً نہیں، بلکہ قوم اسرائیل، نسل اسرائیل ہے اور یہ لوگ آپؐ کو بھی اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے کہ اسرائیلی پیمبروں کو۔

تعصب کو کام میں لائیں تو بات دوسری ہے

درمیان کی بہت سی آیتوں کو طے کرتی ہوئی، آخری نظر اس آیت پر جا کر ٹِکتی ہے، بلکہ رُک جاتی ہے۔ پوری آیت ذرا بڑی ہے۔ غرضِ مقصود کے لئے نصف آیت بالکل کافی ہے۔

> لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ
> الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
> وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى
> حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ
> وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ (آیت ۱۷۷)

"طاعت یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) اور پیمبروں پر اور اس کی محبت میں مال تقسیم کرے قرابت داروں پر اور یتیموں پر اور سائلوں پر اور راہ گیروں پر۔"

آیت قرآن مجید کی مشکل ترین آیتوں میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اصلاً بیان صرف دو چیزوں کا ہے، ایک اس کا کہ بِر یا طاعت یا نیکی کیا نہیں، اور ایک اس کا کہ بِر یا طاعت یا نیکی کیا ہے۔ اس دُوسرے سوال کا جواب بہت لمبا ہے۔ فلاں فلاں عقیدے اور فلاں اعمال طاعت کے ضروری اجزاء ہیں۔ طاعت کے جو ضروری اجزاء ہیں ان میں اختلاف کسی کو نہیں۔ اللہ، قیامت، انبیاء وغیرہ پر اعتقاد ہونا چاہیئے۔ مالی امداد عزیزوں، یتیموں، فقیروں وغیرہ سب کی کرنا چاہیئے۔ گفتگو صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ قرآن نے یہاں طاعت کے دائرہ سے باہر کس عمل کو رکھا ہے؟ یہاں کس عمل کا نام لے کر قرآن نے اس کے طاعت ہونے سے سرے سے انکار کیا ہے؟ وہ ہے مشرق یا مغرب کی

طرف رُخ کرنا"۔ اور مشرق رُخی یا مغرب رُخی کسی قسم کی بھی طاعت یا عبادت نہیں۔ اس استقبال قبلہ میں بھی چونکہ کسی نہ کسی طرف رُخ کرنا ہی پڑتا ہے، اس لیے مفسرین کو اُلجھن یہ پیش آ گئی ہے کہ اس سے تو استقبال کا حکم ہی رد ہوا جاتا ہے۔ حالانکہ آیت سے بیت الکعبہ کی طرف رُخ کرنے کی ممانعت کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نماز میں تو رُخ ایک متعین و معروف مکان۔ بیت الکعبہ کی طرف رہے، اور اب وہ مکان دنیا کے کسی خطے سے جس سمت میں بھی اور جب رُخ پر بھی پڑ جائے۔ حکم میں سمت کی تو سرے سے تعیین ہی نہیں۔ نہ جنوب کی، نہ شمال کی، نہ مشرق کی، نہ مغرب کی۔ اب اتفاق سے چونکہ وہ عمارت نمازی کے کسی نہ کسی سمت میں لامحالہ پڑے گی، اس لئے سمت کا تصور خود اس حکم کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور اس نے قلب مومن میں اُلجھن پیدا کر دی۔ اصل میں حکم کی زد مشرک قوموں پر پڑتی ہے جن کے ہاں شرک کی بیسیوں قسموں، آفتاب پرستی، ستارہ پرستی، بت پرستی وغیرہ کے ساتھ ایک خاص قسم سمت پرستی کی تھی، اور کچھ مشرک قومیں طلوع آفتاب کی بنا پر مقدس سمت مشرق کو سمجھنے لگیں تھیں۔ اور کچھ قومیں غروب آفتاب کی مناسبت سے سمت مغرب کو! قرآن کو یہاں مخالفت و ممانعت محض اس جہت پرستی یا سمت پرستی کی کرنا تھی! آیت اس خطبہ میں اصلاً صرف اُس کے پہلے ٹکڑے لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کی خاطر پیش کی گئی، لیکن ضمناً یہ بات بھی سن لینے کی ہے کہ آیت قرآن کی اہم ترین و محکم ترین آیتوں میں سے ہے۔ اور حدیث ہی میں تو یہ صراحت اور بشارت موجود ہے کہ

من عمل بهذه الآية فقد استكمل۔

جس نے اس آیت پر عمل کر لیا، اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔

اور مفسر قرطبی نے لکھا ہے:۔

وقال علماءنا هذه اٰية عظيمة من اُمّهات احكام القرآن

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ یہ احکام قرآن کی کلیدی آیتوں میں سے ہے

اور آگے اس سے سولہ مسئلے عقائد و طاعات کے نکال کر گنائے ہیں۔ صوفیہ محققین نے بھی آیت کو شریعت و طریقت کا جامع بتایا ہے اور ایک پُر لطف بات یہ بھی ہے کہ پادری ویری (WHERRY) صاحب جنھوں نے سیل کے انگریزی ترجمۂ قرآن کو زمین بنا کر اس پر چار جلدیں اپنی تفسیر کی لکھ ڈالی ہیں، ان کے قلم سے قدرت یہ عبارت لکھواتی ہے

> "یہ آیت قرآن کی بلند ترین آیتوں میں سے ہے ... . ذات باری پر ایمان نوع انسان کے ساتھ سلوک، اس کو اس میں واضح طور پر مذہب کا جوہر اصلی بتایا ہے اس میں لُب لُباب عقائد اور اعمال کا آگیا ہے"۔

غنیمت اور بہت غنیمت ہے کہ پادری صاحب موصوف کو قرآن مجید میں کچھ آیتیں تو بہت بلند قسم کی نظر آگئیں۔

۱۵

اس کے معاً بعد حکم قصاص کا شروع ہو جاتا ہے اور آیت قصاص کی آجاتی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (آیت ۱۷۸)

"اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے"

اس میں سرسری طور پر پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اس حکم کے مخاطب کلمہ گو اُمت کے افراد نہیں کہ جس کسی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہوئی، بس اُس نے اس کی مار کاٹ اندھا دھند شروع کر دی۔ حکم امت کے اہل حل و عقد کو مل رہا ہے۔ حکم انھیں مل رہا ہے جو ایک اجتماعی وجود اور طاقت رکھتے ہیں اور اپنی حکومت کے قانون پر نفاذ کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح سمجھنے کا دوسرا لفظ قصاص ہے۔ "قصاص" انتقام محض کے مرادف نہیں، بلکہ قانون فوجداری کے ماتحت انتقام کی ایک منظم و مہذب شکل کا نام ہے، اور اُمت کا ایک قانونی و اجتماعی حق ہے۔ اس کے نفاذ کی ذمہ داری عدالت پر عائد ہوتی ہے۔

اسلامی قصاص کا جزو اہم یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ رہے گی اور خون خون

سب کا برابر رہے گا۔ یہ نہیں کہ اونچے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ سمجھی جائے۔ ایک مقتول کے قصاص میں دوسری قوم یا پورے قبیلہ کو تباہ کر دیا جائے۔ عرب جاہلی میں ایک دستور یہ بھی پڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالتا تو قصاص میں جان اس آزاد کی لینے کے بجائے کسی غلام کی لی جاتی اور جاہلی عرب کا ایک دستور یہ بھی ہو گیا تھا کہ اگر قاتل کسی ادنیٰ قبیلہ کا شخص ہوتا تو کسی اعلیٰ قبیلہ کے ایک مقتول کے عوض قصاص اس ادنیٰ قبیلہ کے دو شخصوں سے لیا جاتا۔ اور دنیا کی تاریخ آج بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ امریکہ میں آج بھی ایک گورے (WHITE) کا خون ایک کالے (NEGRO) کے خون سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اور فرنگی حکومتیں، ابھی چند ہی سال کی بات ہے کہ اپنے ایک مقتول کے عوض کالی قوم والے قاتل کے متعدد ہم قوموں کی جانیں لئے بغیر تسکین حاصل نہیں کرتی تھیں۔

یہاں پہنچ کر فقہائے مفسرین کے اس نکتہ سنجی کی داد دیجئے کہ انھوں نے قصاص کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے کہ:۔

ای المساواۃ بینھما لا الزیادۃ ۔

قصاص سے مراد یہ ہے کہ بس اتنا ہی لیا جائے گا زیادہ نہیں۔

اور نسفی صاحبِ مدارک التنزیل کے الفاظ میں :

القصاص عبارۃ من المساوات والمعنی فرض علیکم
اعتبار المماثلۃ والمساواۃ من القتلیٰ

"قصاص سے مراد مساوات ہے، اور مطلب کہنے کا یہ ہے کہ قتل کے بارے مماثلت و مساوات ہی کو دیکھا جائے گا"۔

۱۶

قتل و قصاص کے سلسلہ میں ایک نیا لفظ قرآن کی زبان سے دیت کا سن لیجئے

یا اُردو میں خون بہا۔

نیا اس معنی میں کہ دنیا کے اکثر مہذب قانونوں میں اس کا مرادف نہ ملے گا، رومیوں کے قانون میں قتل ایک فوجداری کا جرم تھا، دیوانی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور فرنگی قانون چونکہ اسی رومی قانون کا نقش ثانی ہے اس میں بھی جرم قتل صرف فوجداری کا جرم ہے لیکن اسلام چونکہ عین دین فطرت ہے۔ اس نے قتل کو ایک حد تک دیوانی کا جرم بھی تسلیم کیا ہے، اور اس نے یہ حقیقت سامنے رکھی ہے کہ قتل جس طرح اسٹیٹ یا حکومت اور سوسائٹی یا معاشرہ کے ایک قانون کی خلاف ورزی ہے، اسی طرح یہ بھرپور حملہ اس کی شخصی حیثیت پر بھی ہے گویا یہ جرم دو گونہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک پبلک یا عمومی۔ دوسرے نجی یا انفرادی اسی لئے مقتول کے وارثوں یا خون کے مدعیوں کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ چاہیں تو قاتل کو پوری سزا حکومت سے دلائیں۔ اور اگر چاہیں تو خود مالی معاوضہ لے کر انتہائی سزا سے دست بردار ہو جائیں۔ بس اسی کو اصطلاح شریعت میں دِیَت کہتے ہیں۔

DAMAGES کا انگریزی لفظ آپ نے سُنا ہوگا۔ جب کسی ملک کی رعایا کا خون دوسرے ملک میں ہو جاتا ہے اور اجنبی ملک میں فوجداری کا مقدمہ چلانے میں دشواریاں اور زحمتیں محسوس ہوتی ہیں، تو جائز ہے کہ بجائے فوجداری استغاثہ اور اس کی پیروی کے صرف ہرجانہ کی مالی رقم پر کفایت کر لی جائے Damages اسی ہرجانہ کو کہتے ہیں، اور ایک حد تک یہ مثل خون بہا کے ہے Damages کا لفظ آپ نے صاحب، کی زبان سے سُنا ہے، آپ کو مانوس معلوم ہوتا ہے، دیت یا خون بہا آپ صرف مولوی مُلّانوں کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، اس لئے قدرتاً آپ کو نامانوس معلوم ہوتا ہے۔

۱۷

آگے قاتل و مقتول دونوں کے فریقوں کو خوب تاکید ہے، عدل و رفع شر اور ظلم

اور زیادتی سے بچنے کی۔ ایک فریق پر اس کی کہ وہ خوں بہا کا مطالبہ معقولیت کے حدود کے اندر رہ کر کرے، آدمیت سے کرے، غصہ اور اشتعال سے بات کو بتنگڑ نہ بنائے اور معاملہ کو اور آگے نہ بڑھائے اور دوسری طرف قاتل کے یا ملزموں کے فریق کے دل میں یہ بات اُتاری ہے کہ جتنی رقم کی قرارداد ہو چکی ہے، اسے بغیر کسی طوالت یا پیچیدگی اور بدمزگی کے خوش اسلوبی کے ساتھ پہنچا دیں۔ اور دونوں فریق اُمت یا معاشرہ کو فسادِ مزید سے ہر طرح بچائے رکھیں ـــــ اور مضمون کو ختم ان دو آیتوں پر کیا ہے:

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ
يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (آیات ۱۷۸ - ۱۷۹)

”یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے اور تمہارے لئے (قانون) قصاص میں زندگی ہے، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ“۔

اتنی نفسیاتی نزاکتوں کا پاس رکھنا، اور ہر فریق کو نفسانیت کے اثر سے بچائے رکھنا، یہ شان صرف خدائی ہی قانون کی ہو سکتی ہے، اور اسی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ایک طرف قصاص کی بظاہر سختی، اور دوسری طرف دِیت و عفو کی نرمی، یہ حُسنِ امتزاج اور اعتدال۔ توازن کا مکمل قوام وہی قانون ہو سکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں بلکہ حکمت مطلق سے نکلا ہے ـــــ اور جو لوگ اس قسم کی زیادتیوں پر آمادہ رہتے ہوں کہ کسی پر جھوٹا دعوے قتل کا دائر کر دیا، یا کسی قاتل کو پہلے تو بالکل معاف کر دیا اور پھر معافی کے بعد درپے پورے قصاص کے ہو گئے۔ ایسے بے انصافوں اور خدا ناترسوں کو روکنے والا عذاب الیم یا خوف آخرت ہی ہو سکتا ہے ـــــ اور یہ ساری ہدایتیں، ترغیبیں ہیں ہی، اسی لئے کہ سارا معاشرہ پرہیزگار ہو، منصف مزاج ہو

عدل شعاروں کی قوم بن جائے، بلکہ امت کا مزاج ہی عدل و تقویٰ پر قائم ہو جائے۔

نمبر (۱۸)

روزمرہ کے احکام قرآن میں متفرق و متعدد مقامات میں نہیں ملتے۔ جو بھی حکم ملا ہے، مختصر جامعیت کے ساتھ ایک ہی مقام ہے اور سُن رکھنے کے قابل ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (آیت ۱۸۳-۱۸۴)

"اے مسلمانو تمہارے اوپر روزہ فرض کیا گیا ہے، جیسا کہ تم سے پیشتر سے لوگوں پر فرض ہو چکا ہے، یہ روزے گنتی کے چند روز ہیں۔

روزے کے حکم سے طبعی وحشت دور کرنے کے لئے پہلے تو یہی فرمایا گیا ہے، کہ یہ تمہارے لئے کوئی نیا حکم، کوئی نئی سختی نہیں، یہ حکم تو پہلی قوموں کو بھی مل چکا ہے۔ لیکن یہ مثلیت صرف فرضیت کے لحاظ سے ہے، تعداد، زمانہ، مقصد و غایت وغیرہ کے لحاظ سے نہیں۔ روزے قمری جنتری کے نویں مہینہ میں ہوتے ہیں، جسے ماہ رمضان کہا جاتا ہے اور ہر ہلالی مہینہ کی طرح یہ مہینہ بھی گھوم پھر کر سال کے ہر موسم میں آتا رہتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں روزہ نام ہے طلوعِ فجر سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور عملِ زوجیت سے بچے رہنے کا۔ اور حدیث میں سخت تاکید غیبت، فحش، جھوٹ، بد زبانی، دل آزاری وغیرہ ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی آئی ہے۔ دنیا کی طبیں اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کو دور کرنے والا اور علاج جسمانی کا ایک بہترین نسخہ ہے اور اصلاح نفس و تزکیۂ روح میں جو اس سے مدد ملتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ پھر اس سے سپاہیانہ برداشت اور ضبطِ نفس کی تربیت جو تازہ ہو جاتی ہے اس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین پروگرام ہے۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ، ایک عجیب جامعیت کا دو لفظی ننھا سا فقرہ ہے، جس کے اندر ساری ظاہری اور باطنی، اور انفرادی اور اجتماعی فضیلتیں آگئیں۔ گویا مقصود صرف حصولِ تقویٰ ہے۔ تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے محتاط رہنے سے جسمانی صحت درست ہو جاتی ہے، بھوک کھل جاتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے، مادّی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح اِس عالمِ آب و گِل میں تقویٰ اختیار کئے رہنے سے آخرت کی نعمتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت انسان میں پوری طرح پیدا ہو کر رہتی ہے۔

اور معاً بعد ہے اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، کم ہمتوں کی ڈھارس بندھانے کو یہ کہ کوئی بڑا طویل زمانہ اس کے لئے نہیں۔ دو تین مہینہ کی مسلسل مدت بھی اس کے لئے ضروری نہیں۔ کُل ایک مہینہ کی مدت۔ اور پھر اس میں بھی بکثرت رعایتیں۔ وقتی طور پر بیمار مستثنیٰ، مسافر مستثنیٰ، دیرینہ سال مستثنیٰ، اور ان میں سے کوئی معذوری مستقل تو استثناء بھی مستقل۔ وحدتِ امت کی حکمت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ زمانہ ایک ہی متعین ہو۔ چنانچہ زمانہ متعین اور دوسرے شرائط بھی متعین۔

اور ایک بڑی رعایت فدیہ دینے کی ہے۔ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کے ماتحت اطاقت کی پوری بحث یہاں دہرائیے تو خاصی طوالت کی نوبت آجائے۔ مختصر یہ کہ عربی میں وسعت اور طاقت دونوں کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ وسعت کے معنیٰ تو گنجائش و امکان کے ہیں۔ کسی کام کو بہ سہولت انجام دے دینے کے ہیں۔ اور طاقت یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کو کر ڈالے لیکن مشقت کے بعد، یا جان ہلکان کر کے ہی کر سکے۔ جن حضرات کو ذرا تفصیل سے اس بحث کے دیکھنے کا شوق ہو، وہ خاکسار کی تفسیر میں اس مقام کو ملاحظہ فرمالیں۔

اس سلسلہ کی آیتوں میں خصوصی اہمیت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں:۔

فَمَنْ شَہِدَ مِنْکُمُ الشَّہْرَ فَلْیَصُمْہُ (آیت ۱۸۵)

"سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے تم چاہیئے کہ وہ مہینہ بھر روزے رکھے۔"

اہم ترین لفظ "شہود شہر" کا ہے، یعنی مہینہ کے پالنے کا۔ یعنی فرضیت روزہ کی اس کے لئے ہے جو ماہ رمضان کا شہود کرے۔ اس مہینہ کو پائے۔ لیکن اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں چاند شروع مہینہ میں طلوع ہی نہ ہوتا ہو، وہاں فرضیت کا حکم ہی نہیں باقی رہے گا یہ اور بات ہے کہ وہاں بھی تاریخوں کا حساب کر کے رمضان ادا کر لے۔ جیسے ان ملکوں میں جہاں سورج طلوع ہی نہیں ہوتا، یا برائے نام طلوع ہوتا ہے، نماز بھی گھڑی سے حساب لگا کر کسی طرح پڑھ لی جائے گی۔ آیت کے اندر ایسے الفاظ لے آنا جس سے استدلال ایسے نادر الوجود ملکوں کے وجود پر ہو سکے، اعجاز قرآنی نہیں تو اور کیا ہے؟

ابو بکر جصاص رازی، قدیم فقہائے حنفیہ میں مرتبۂ امامت رکھتے ہیں، اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں آیت میں مذکور و مندرج احکام کا ذکر کرتے ہیں، وہاں نمبر اوّل پر اسی شہود شہر کو بنیاد فرضیت قرار دیتے ہیں:۔

> فیه عدة احکام منها ایجاب الصیام علی من شهد
> لا علی من لم یشهد'۔

" اس میں متعدد احکام ہیں، ان میں روزے کا وجوب ان کے لئے جنھوں نے مہینہ کو پایا۔ نہ کہ ان کے لئے جنھوں نے مہینہ کو نہیں پایا

کتنے شبہات کا جواب اس ایک لفظ "شہود شہر" سے نکل آیا!

(۱۹)

بلاغت قرآنی کا ایک عام اسلوب یہ بھی ہے کہ جزئیات احکام بیان کرتے کرتے، بظاہر محض برسبیل تذکرہ یا اتفاقیہ کوئی عام قاعدہ یا اصولی نکتہ بیان کر دیا جاتا ہے جس کے اندر کوئی گہرا مغز ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ صوم و صیام کے مسائل و احکام بیان کرتے کرتے بیچ میں یہ ٹکڑا بھی لے آتا ہے:

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ
وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ۔ (آیت ۱۸۵)

"(ان تمام انتظامات سے) اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔

یعنی یہ ساری رعایتیں اور سہولتیں جو بیان ہوئیں اس سے مقصود اللہ کو بندہ کے حق میں آسانیاں ہی فراہم کرنا ہے نہ کہ سختیاں اور دشواریاں۔ چنانچہ جو روزے قضا ہو جائیں، ان کی تکمیل اگر کر لو تو روزوں کی ادائی کا اجر پورا مل جائے گا، اور گھاٹا کچھ نہیں اٹھانا پڑے گا ـــــ اور ایک صوم وصیام پر کیا موقوف ہے۔ ہر حکم کی تہ میں بندوں کے حق میں مصلحتیں اور رحمتیں ہی ملیں گی اور جہاں کوئی بھی دشواری یا معذوری پیش آئی، بس اس کے مناسب ومتناسب کوئی نہ کوئی رخصت یا رعایت بھی مل گئی۔

اور مسائل رمضان ومتعلقات رمضان کا ابھی تکملہ ہی ہو رہا ہے کہ یہ آیت نظر پڑ جاتی ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ
لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (آیت ۱۸۵)

(اور اے پیغمبر) "آپ سے میرے بندے جب میرے باب میں سوال کریں، آپ کہہ دیجیے کہ میں نزدیک ہی ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے تو بندوں کو چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت یاب ہوں"۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے متعلق سوال یہ ایک الگ سے بات کہاں سے آ گئی، لیکن ذرا غور کیجیے تو صاف سمجھ میں آ جائے کہ رُخ میں جو چلا اس روزہ داری اور

شب بیداری سے پیدا ہوتی ہے، اُس کا عین تقاضا ہے کہ تعلق باللہ کی رُوح بیدار ہو اور طبیعت میں اللہ سے مانگنے، سوال کرنے اور اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے، گڑگڑانے کی ہوا سر پر سوار ہو۔ رمضان میں اس تعلق کی طلب اور تڑپ پیدا ہونا تو عین مقتضائے حال کے مطابق ہے۔

پھر ایک اور باریکی ملاحظہ ہو۔ آیت میں خطاب براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ جناب باری سے تعلق کے لئے، توسط رسول اللہ ہی کے ساتھ مخصوص رکھنا اور انھیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف گمان نہ لے جانا ——— خدا کے ساتھ بندوں کا ربط و تعلق، جو قدیم مذہبوں کے سامنے ایک سخت گتھی ہمیشہ رہا کی ہے اور اکثر مذہبوں نے تو خدا کو اتنا دور اور بندوں سے اتنا بعید فرض کر لیا ہے کہ اس تک رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔ قرآن نے اس وہم کو دُور کر دیا اور صاف صاف بتایا ہے کہ جسے تم دُور سمجھ رہے ہو، وہ دور نہیں، نزدیک ہی ہے، اور اس سے تم ربط ہمیشہ ہی حاصل کر سکتے ہو۔ یہ قریب رہنا تو ہمیشہ ہی ہے اور رمضان میں اس عموم میں خصوص پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ربط خاص سے خاص تر ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچئے، بندوں کے لئے تسلّی، تسکین، راحت کا کتنا سامان اس آیت کے اندر رکھ دیا ہے۔

اپنے خدا کو ڈھونڈھنے کے لئے، اس سے راز و نیاز کرنے کے لئے کہیں اور نہیں جانا ہے، وہ تو ہم سے قریب ہی ہے۔

ایک نکتہ اس آیت کے ذیل میں اور ہے۔ اس ایک آیت کے اندر ضمیر متکلم کتنی بار عَنِّی میں، فَاِنِّی میں، اُجِیْبُ میں، دَعَانِ میں، لِیْ میں، بِیْ میں صیغۂ واحد میں آتی ہے۔ زبان کے نکتہ سنجوں اور بلاغت کے راز آشناؤں کا قول یہاں پہنچ کر پھر یاد کر لیجئے کہ ضمیر جمع متکلم جس طرح دلالت کرتی ہے قدرت، عظمت و قوت پر، اقتدار و حکومت پر، ضمیر واحد متکلم اسی طرح مخصوص ہے التفات، اختصاص اور یگانگت

کے لئے! ـــــ خوش نصیب بندے! تیرا پروردگار تجھ کو کتنا اپنے قریب کھینچتا جا رہا ہے!

آیت کے الفاظ پر نظر ایک بار پھر ہو، اُجِیبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ: پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، ہر پکار سُنتا ہوں، اس میں کوئی شبہ نہ ہو۔ اور پھر جن دعاؤں کو قابل قبول سمجھتا ہوں انھیں قبول بھی کر لیتا ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے ہاں ہر دعا اندھا دھند قبول ہی ہو جاتی ہے۔ ہاں سُنی، ہر دعا لی جاتی ہے، معقول یا نامعقول بندہ غریب کو کیا خبر کہ کون اس کے حق میں مفید ہو گی، کون مضر۔ قبول تو بس وہی دعائیں ہوں گی جو رحمت و حکمت مطلقہ کے منافی نہ ہوں گی۔

وَلْيُؤْمِنُوا بِي اور ایمان لائیں مجھ پر۔ ایمان محض میرے اوپر رکھیں، ایمان اگر وہ سرے سے کہیں اور رکھتے تو دعا ہی مجھ سے وہ کیوں کرتے۔ نہیں، بلکہ ایمان لائیں میرے صفات کاملہ پر، میرے حکیم ہونے پر، میرے حاکم ہونے پر، میرے قادر ہونے پر، اور میری رعایت مصالح پر

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝ تاکہ ان پر فوز و فلاح کی، ہدایت کی راہیں کھل جائیں، تاکہ فلاح دارین کے دروازے ان پر کھل کر رہیں اور ایمان کامل اور تعمیل احکام الٰہی کے بعد درجۂ مرشد تک پہونچ جانے میں امر مانع بھی کیا ہو سکتا ہے؟

۲۰

جہاد و قتال کا ذکر تو قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور اس کے احکام قرآن کے متفرق حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جگہ اس ضمن میں پارہ سیقول کے نصف اول میں ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَی

التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آیت ۱۹۵)

"خرچ کرتے رہو اللہ کی راہ میں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیک کام کرتے رہو۔ بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"

جس جنگ کا نام شریعت کی اصطلاح میں جہاد ہے، اور جسے قرآن میں قتال سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ ملک گیری کے لئے، سلطانی شان و شوکت کے لئے، عسکری فتح مندی اور نام آوری کے لئے جائز نہیں۔ اس کے لئے سب سے بڑی، سب سے کڑی، سب سے پہلی قید لگی ہوئی ہے فی سبیل اللہ کی، اللہ کی راہ میں ہونے کی۔ جان اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وہ نفس کی راہ میں گنوانے کے لئے نہیں۔ صرف دین کی خدمت میں پیش کر دینے کے لئے ہے۔ اور جان کے بعد ذکر مال کا، نعمت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کے لئے بھی شرط وہی فی سبیل اللہ کی لگی ہوئی۔ قدر اس صرف مال کی نہیں جو ہوائے نفس کی راہ میں ہو، ناحق و باطل کے لئے ہو۔ لیکن اس حکم کے ساتھ یہ دوسرا حکم کیسا جڑا ہوا ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں مت ڈالو، یعنی یہ منع قتال کی تعلیم کیسی؟

جی نہیں، منع قتال کہاں؟ سیاق سے تو عین تائیدی اور تاکیدی حکم مل رہا ہے۔ کہ جہاد و قتال کا موقع آ جانے پر مجاہدوں کی مالی ضرورتوں کی طرف سے غفلت ہرگز نہ برتی جائے، ان کی مالی اعانت میں بخل کر کے امت کو تباہی و ہلاکت میں ہرگز نہ ڈالو۔ دل کھول کر ان کی مدد کرتے رہو، اور اس موقع پر دست کشی کو بالکل ہی خودکشی کے مرادف سمجھو! ——— اور آیت کا بقیہ حصہ اس کی تشریح و تقویت کے لئے ہے۔

التھلکۃ کے یہی معنی صحابہؓ سے منقول ہیں۔ صحابیوں میں عبد اللہ ابن عباسؓ، ابو ایوب انصاریؓ اور حذیفہؓ نے لئے ہیں۔ اور یہی تابعین میں حسنؒ، قتادہ، عکرمہ اور عطاء سے مروی ہیں

تو گویا آیت سے جو پہلو منع جہاد کا بے غوری کی بنا پر نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا، وہ

درحقیقت عین ترغیب وتاکید میں ہے۔ اور آخر آیت میں احسان اور محسنین میں اشارہ جہاد اور مجاہدین ہی سے ہے۔ احسان یعنی حُسنِ عمل اسی مفہوم میں ہے۔

۲۱

احکام جہاد وقتال کے بعد ہی مسائل حج شروع ہو جاتے ہیں، اور اس سلسلہ میں عازمان حج سے خطاب کرکے آیا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا (آیت ۱۹۷) زاد راہ لے لیا کرو

غیر مذہب والے عجب نہیں کہ اس حکم کو حیرت سے سُنیں اور کہنے لگیں کہ یہ حج کا سفر تو عین عبادتی سفر اور خدا کی راہ کا سفر ہے، اس کے ضمن میں یہ ظاہری سامان پر زور کیسا؟ اس کے لئے تو تدبیر تمام تر اس پر چھوڑ دینا چاہئے جس کی خاطر سفر کیا جا رہا ہے۔ تیرتھ یاترا کی شان تو یہی ہے۔ اس سفر میں تو ہر اقدام ماسوائے علیحدگی کا ہونا چاہئے ——

جی نہیں۔ یہی تو بڑا فرق اسلام اور دوسرے مذہبوں کے درمیان ہے۔ قرآن کے سامنے تو ان ناقص مذہبوں کے نمونے موجود تھے جن کے پیرو تیرتھ یاترا یا زیارت آثر ومقابر کے لئے نکلتے، تو مفلس وقلاش ہوکر، ننگے اور بھوکے اور مانگتے کھاتے ہوئے اور اپنا بار دوسروں پر ڈالتے ہوئے بدھ مذہب کے بھکشو تو خصوصاً اس لت میں مبتلا تھے اور عرب جاہلی کنگال بن کر زیارت کو قابل فخر سمجھتے، حدیث بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس صحابی کی روایت ہے:

> کان اهل الیمن یحجون ولا یتزودون ویقولون نحن المتوکلون فاذا قدموا بمکة سألوا الناس۔

> "یمن والے حج کرتے جاتے تو زادراہ نہ لیتے بلکہ یہ کہتے رہتے کہ ہم تو متوکل ہیں، اور جب مکہ پہنچتے تو لوگوں سے مانگتے رہتے۔

اور تفسیر ابن جریر میں ہے:

کانوا یحجون بغیر زاد کان بعضهم اذا احرم رمیٰ ما معه من الزاد

"لوگ حج تو کرتے مگر بغیر زاد لئے ہوئے اور کوئی تو ایسا بھی ہوتا جو احرام پہن لینے کے بعد زاد کو پھینک دیتا۔"

اور تفسیر قرطبی میں ہے:

من العرب کانت تجیئ الی الحج بلا زاد ویقول بعضهم کیف نحج بیت الله ولا یطعمنا

عربوں میں سے بعض حج کو آتے بلا کسی توشہ راہ کے اور بعض ان میں سے کہتے ہم اللہ کے گھر کا حج کس طرح کریں تا آنکہ وہ ہمیں نہ کھلائے۔

تو قرآن کو اس جھوٹے توکل، اس نمائشی روحانیت سے روکنا اور ہر حاجی و زائر میں شخصی غیرت و خودداری پیدا کرنا تھا اور دوسری طرف اجتماعی معاشیات کو ایک خواہ مخواہ کے بار سے روکنا تھا اور ایک تمام غلط رسم و رواج سے نجات دلانا۔ اس لئے تاکیدًا ارشاد ہوا ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (آیت ۱۹۷)

"اور زادِ راہ لے لیا کرو، اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے۔ سو میرا ہی تقویٰ اختیار کئے رہو، اے اہلِ فہم۔"

اور جس تقویٰ کو یہاں تاکید اور تکرار کے ساتھ کہا گیا ہے، اس کی ایک بڑی شرط ہے گداگری سے احتراز اور دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنے سے احتیاط، اور اپنا بار دوسروں پر ڈالنے سے اجتناب ـــــ قرآن کے بہترین ترجمانوں نے اس سیاق میں تقویٰ سے

مراد یہی لی ہے۔ کشاف میں ہے:

ای اتقوا الاستطعام وابرام الناس والاشتغال علیهم

"یعنی بچو لوگوں سے کھانا مانگنے سے، لوگوں سے گلے پڑنے سے، اور ان پر بارِ خاطر بننے سے۔

اور مدارک میں ہے:۔

الاتقاء عن الابرام والتشغل علیهم۔

"بچنا ہے لوگوں کے گلے پڑنے اور ان پر بارِ خاطر ہونے سے"

آیت کے خاتمہ پر تخاطب اولوالالباب یا اہل فہم سے خاص طور پر پُرمعنی ہے یعنی غور و فکر خود ہی تمھیں نتیجہ تک پہنچا دے گا۔ اور فہم و تدبّر والے دل سے ایسی پُرحکمت ہدایات کی قدر کریں گے۔ نتیجہ میں انفرادی، اجتماعی، روحانی، اخلاقی و معاشری سارے ہی پہلو فوز و فلاح کے آجاتے ہیں

(۲۲)

اور یہ جو ابھی عرض ہوا ہے کہ روحانی و اخلاقی کے ساتھ مادی فوز و فلاح بھی حاصل ہوگا تو اسے انکار کے کانوں سے نہ سنیئے، اور اسے حُسن گرا سمجھنے میں نہ پڑیئے معانیِ تنزیل مبارک ہی میں صراحت کے ساتھ ارشاد ہوا جاتا ہے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (آیت ۱۹۸)

اور کوئی مضائقہ نہیں اس باب میں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو۔

فضلاً سے کھلی ہوئی مراد مالی تجارتی منفعت ہے۔ اس مفہوم پر ابن عباس صحابی سے لے کر تابعین تک متحد ہیں، اور یہاں بھی قرآن دوسرے مذہبوں کا خشک غلو توڑ رہا ہے اور رہبانیت کے تصور پر ضرب لگا رہا ہے۔

اہل جاہلیت کی خشکی کہیئے یا وہم پرستی، اس باب میں اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ حج کے موقع پر جو تاجر مال تجارت لے کر منیٰ و مکہ کے بازاروں میں اُترتے تھے، بلکہ جو اونٹ والے اپنے اونٹ مکہ، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کو لے جاتے تھے، سمجھا جاتا تھا کہ ان لوگوں کا حج ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جہاں تجارت آگئی، عبادت کا وجود ہی کہاں باقی رہ گیا؟ قرآن مجید اپنے حکیمانہ اسلوب بیان کے ساتھ قدم قدم پر ان ساری غلط فہمیوں اور غلط غیرت مندیوں کے پردے چاک کرتا جاتا ہے، اور حقائق کے چہرے سے نقاب اُٹھاتا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دوسرا خطبہ

(۲۳)

عورت مرد کے باہمی تعلق اور تفاضل کا مسئلہ ہمیشہ سے بڑے معرکہ کا چلا آرہا ہے۔ پرانے فلسفہ اور پرانے تمدن نے مرد کو آسمان پر چڑھا اور عورت کو زیرِ زمین اُتار دیا تھا اور فرنگستان جدید میں بھی خال خال کوئی فلسفی مفکر اور سوشیالوجسٹ اس آخری خیال کے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً جرمنی میں شوپنہار Schopenhauer برطانیہ میں کیپٹن لڈوسی اور میڈم شارلیپ Madam Sharlip اور ایران ہو کہ ہندوستان سب کہیں کہاوتیں مثلیں وغیرہ اسی مفہوم کی چلی آرہی ہیں۔ لیکن جدید فرنگستان نے اسی کے ردعمل کے طور پر نظریہ بالکل ہی دوسرا رکھا ہے۔ یہاں عورت سر پر چڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اور قریب ہے کہ صنفِ نازک کی افضلیت اور اولیت کا اعلان بطور ایک مسلّمہ کے ہو جائے۔ اب قرآن نے دیکھیے کیسا محتاط اور متوازن فیصلہ صادر کیا ہے۔

اصل اصولی اور بنیادی فارمولا اس نے یہ بتایا ہے اور وہ بھی کس ایجاز کے ساتھ۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (آیت ۲۲۸)

اور عورتوں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ ان کے اوپر ہے موافق دستورِ شرعیہ کے

سلیس و عام فہم اردو میں اسے یوں کہئے کہ جس طرح مردوں کے حق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حق مردوں پر ہیں۔ اور یہ نہ سمجھو کہ شوہروں کے حق میں فرائض

بس، بیویوں کے ذمہ عائد ہوتے ہیں، بلکہ ایسے ہی فرائض بیویوں کے حق میں شوہروں کے ذمہ بھی عائد ہوتے ہیں اور یہ اصل اصول کی منادی چھٹی صدی کے ایک اُمّی عرب کی زبان سے اُس وقت کرائی گئی، جب دنیا میں یہودیت، نصرانیت، ہندویت مجوسیت، غرض سبھی مذہبوں کی زبان سے کہلایا یہ جا رہا تھا کہ

"شوہر بیوی کا آقا و مالک ہے، اور بیوی اس کی مملوکہ"

"عورت جہنم کا دروازہ ہے اور ہر بشر میں شر کا باعث اسے حقیر و ذلیل سمجھنے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ وہ عورت ہے"۔

ان دو عبارتوں میں یہودیت اور نصرانیت کی تعلیمات کا خلاصہ آگیا اور ایسا ہی کچھ حال چین کے حکیم کنفوشس اور ہندومت کے منوجی اور بدھ مت اور مجوسیت وغیرہ کے صحیفوں کا نظر آتا ہے۔ ان سب کے اقتباسات اگر نقل ہوں، تو یہ خطبات اپنے اصل موضوع سے دور ہی جا پڑیں۔

اور جب قرآن نے عورت کی یہ اصلاً مساویانہ پوزیشن مضبوط کرا لی، تو اپنی حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کی بنا پر اس اہم تکملہ اور ضروری ضمیمہ کا بھی اعلان کر دیا، کہ

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ (آیت ۲۲۸)

اور مردوں کو ان کے اوپر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

قرآن جس طرح جاہلیت قدیم کے اس دعویٰ کو مسترد کر رہا ہے کہ عورت حقیر و ذلیل ہے۔ اسی طرح جاہلیت جدید کے بھی اس قول بے دلیل کے ماننے سے انکار کر رہا ہے کہ مرد و عورت ہر حیثیت سے مساوی اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں۔ مساوات کامل اور مساوات مطلق دونوں جنسوں کے درمیان نہیں۔ بلکہ مرد کو عورت پر من وجہ یا ایک گونہ ترجیح اور فوقیت حاصل ہے ____ قرآنی لفظ درجۃ خوب خیال میں رہے۔ مرد عورت کا مالک نہیں۔ عورت اس کی کنیز یا زر خرید نہیں۔ بہ لحاظ وجوب حقوق دونوں ایک

سطح ۔ بھوک جس طرح ایک کو لگے گی، دوسرے کو بھی ۔ پھر بھی مرد کو عورت پر جسمانی و ذہنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے ایک حد تک ترجیح و فضیلت حاصل ہے ۔ علوم جدید خصوصاً نفسیات کے جن ماہرین نے اپنی عمریں دونوں جنسوں کے طبعی خصوصیات، جسمانی[1] قوے، اور دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے مطالعہ و تحقیق میں صرف کر دی ہیں، ان کی بڑی جماعت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم و مکمل ہیں ۔ تاہم بلحاظ قوت و بہ لحاظ عقل افضلیت مرد ہی کو حاصل ہے اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت کی جاتی ہے، وہاں اپنی نسائیت کا خون کر کر کے ۔

اس اثبات افضلیت سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ افضل مفضول پر کسی قسم کا ظلم، زبردستی یا سختی شروع کر دے، یا اس کی تحقیر و تذلیل جائز سمجھ لے ۔ بلکہ قوی کو کمزور سے اور زیادہ لطف و حسن مراعات رکھنا چاہیئے ۔ صحابی عبداللہ بن عباسؓ جس پایہ کے مفسر ہوئے ہیں، معلوم ہے ۔ ان کا قول سنئے، جو قرطبی میں نقل ہوا ہے ۔

قال ابن عباسؓ الدرجة اشارة الى حض الرجال على حسن المعاشرة والتوسع للنساء فى المال والخلق ان الافضل ينبغى ان يتعامل على نفسه، قال ابن عطية هٰذا القول نفيس مادح ۔

ابن عباس نے کہا ہے کہ لفظ درجہ سے اشارتاً یہ ترغیب مرد کو ہو گئی کہ عورت سے حسن معاشرت رکھے، اور مال اور برتاؤ دونوں میں اس کے ساتھ توسع برتے ۔ اس لئے کہ یہ افضل ہی کی شان ہے کہ اپنے نفس پر برداشت سے کام لے، اور ابن عطیہ نے کہا ہے یہ قول بہت ہی نفیس اور مستحسن ہے ۔

اور آیت کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوا ہے :۔

وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ اور اللہ بڑا زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔

اللہ بڑی قوتوں کا مالک ہے اور ہر مانع پر غالب ہے، وہ جو احکام اپنے بندوں کو چاہے دے سکتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ بڑا حکیم بھی تو ہے، وہ دیتا وہی احکام ہے جو بیشمار حکمتوں اور مصلحتوں کے جامع ہوتے ہیں۔ بندوں بے چاروں کی نظریں کہاں کہاں تک پہنچ سکتی ہیں —— اور اسی شانِ قوت و حکمت کے جلوے اوپر تو اس کے سارے ہی احکام معاشرتی و انتظامی میں نظر آتے ہیں۔

۲۴

زندگی سے محبت اور موت سے خوف، انسان کے لئے ایک امر طبعی ہے اس کا لحاظ کرکے جہاد و قتال کے سلسلے میں عین ترغیب و ترہیب کے درمیان قرآن ایک سبق آموز حکایت بھی کسی قدیم قوم کی بیان کرتا ہے اور چونکہ تذکیر کا مدار اس قوم کی تعیین پر نہ تھا۔ اس لئے اس قوم کے زمانے اور وطن کو بالکل مجمل چھوڑے رکھتا ہے اور انجام کا تعارف یوں کراتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ص (آیت ۲۴۳)

(اے مخاطب) کیا تجھے خبر نہیں ان لوگوں کی جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے، موت کے ڈر سے، اور وہ ہزاروں ہزار تھے۔

رؤیۃ سے مراد ہمیشہ چشم بصارت ہی سے نہیں ہوتی۔ بلکہ خبر معتبر پہنچ جانا، یا غور و فکر سے نتیجہ نکال لینا بھی مراد ہوتا ہے، چنانچہ یہاں یہی مراد ہے۔ قرطبی نے کہا ہے:

ھذہ رؤیۃ القلب بمعنی الم تعلم ۔ یہ رؤیت قلبی ہے مرادف الم تعلم کے

یعنی تجھے کیا اے مخاطب یہ روایت مستند نہیں پہنچ چکی ہے ؟ ___
اور یہ طرزِ تخاطب ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی جانے بوجھے واقعہ سے عبرت دلانا ہوتا ہے ۔ راغب میں ہے

اذا عُدّی رأیت بالی اقتضی معنی النظر المؤدی الی الاعتبار

"جب رأیت کا صلہ الیٰ کے ساتھ آتا ہے تو مقصود کسی واقعہ سے عبرت دلانا ہوتا ہے"۔

اور کشاف میں ہے :

ھذا کلام جری مجری المثل فی معنی العجب ،

"کسی عجیب واقعہ کے لئے یہ طرز کلام آتا ہے"۔

گویا مخاطبین اوّل اہلِ عرب کے لئے یہ واقعہ معروف و معلوم تھا اور اُلوف کا عدد عربی میں ہزارہا ہزار کے لئے آتا ہے ۔ اس کا اطلاق کم سے کم دس ہزار پر ہوتا ہے ۔

فیہ دلیل علی الالوف الکثیرۃ (کشاف)

"اس میں دلیل ہے کہ وہ بکثرت ہزاروں میں تھے"۔

وھو جمع الکثرۃ لا یقال فی عشرۃ فما دونہا (قرطبی)

"یہ عدد جمع کثرت کا ہے اور دس ہزار یا اس سے کم کیلئے نہیں بولا جاتا"۔

اور حَذَرَ الْمَوْتِ کی تصریح نے بتا دیا کہ اتنی بڑی آبادی کا گھروں سے باہر نکل پڑنا یوں ہی اور امر اتفاقی نہیں، موت کے ڈر سے تھا ۔

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (آیت ۲۴۳)

"تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ پھر اس نے انھیں جلا دیا"۔

یعنی اللہ کی مشیت میں ان کی موت ہی مقدر تھی اور جب اس نے یہ ارادہ کر لیا تو کوئی بھی

تدبیر اس کی راہ میں مانع نہ آسکی۔ اور ممکن ہے کہ وہ حکم جہاد ہی کی تعمیل سے جی چُرا کر بھاگے ہوں۔ لیکن بالآخر وبا سے یا کسی اور طریقہ سے، اُلٹے سب موت ہی کے شکار ہو کر رہے۔ سو حکم جہاد، جہاد سے بھاگنا، یا بھاگ بچنے کی کوشش کرنا سب بے کار ہے ——

ثُمَّ اَحْیَاھُمْ، پھر اللہ نے انھیں زندہ کر دیا اور انھیں مشاہدہ کرا دیا کہ موت و زندگی کا سر رشتہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ عقل و تدبیر انسانی کے ہاتھ میں نہیں۔ اسی لئے جہاد یا کسی بھی دوسرے حکم شریعت کی تعمیل سے بھاگ بچنے کی کوشش کرنا انتہائی حماقت اور نادانی ہے۔ کتاب عہدِ عتیق کے صحیفہ حزقی ایل باب ۳۷، آیات ۱ تا ۱۰ میں ایک روایت بصورت کشف و رویا اس سے ملتی جلتی ہوئی موجود ہے۔ اور بعض علمائے عصر نے قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے استناد کر کے یہاں موت و حیات دونوں کو صرف معنوی و مجازی مفہوم میں لیا ہے — ان تاویلات کی قرآن میں گنجائش تو نکل سکتی ہے، مگر بہ تکلف۔ اور آیت کا خاتمہ اس ٹکڑے پر کیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ
لَا یَشْکُرُوْنَ ۝ (آیت ۲۴۳)

"بے شک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ البتہ انسان ہی اکثر شکر ادا نہیں کرتے۔"

چنانچہ فضل کرنے والا پروردگار بندوں کو حکم انھیں کے نفع کے لئے دیتا رہتا ہے۔ اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ بندوں کے دل میں جذبات تمام تر محبت کے اور شکر و احسان مندی کے پیدا ہوتے رہیں اور قصّے ہوں یا احکام بیچ بیچ میں ایسے مضمون ایسے ہی جذبات کی بیداری اور استحضار کے لئے آتے جاتے ہیں۔

(۲۵)

اس قدیم قوم کی حکایت کے، کہنا چاہیئے کہ بعد ہی ذکر اسرائیل میں حضرت

سموئیل کے زمانہ کی ایک جنگ کا شروع ہوجاتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ (آیت ۲۴۶)

(اے مخاطب) کیا تجھے خبر نہیں کہ موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی، جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم لوگوں کے لیے ایک امیر مقرر کردیجیے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔"

یہ پیغمبر حضرت سموئیلؑ تھے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے سے کوئی تین صدی بعد، حضرت داؤدؑ سے کچھ ہی قبل، اور سنہ مسیحی سے کوئی دس، گیارہ سو سال قبل سنہ ۱۱ ق م سے تا سنہ ۱۰۲۰ ق م افرائیم وعلاقہ شام کے کوہستانی شہر رامہ میں آپ کا قیام تھا۔ آیت میں یہ بھی تصریح موجود ہی ہے کہ آپ اس وقت بوڑھے ہوچکے تھے، آپ کے فرزندوں میں سپہ سالاری اور قیادت کی قابلیت نہ تھی ملک کے دشمنوں نے خاص طور پر اٹھا لیا تھا اور اسرائیلیوں کو شکست ہورہی تھی۔

مَلِکٌ عربی میں عام ہے۔ ہر صاحبِ قوت واقتدار کے لئے ہے۔ یہاں سیاق میں مراد امیر جیش یا سردار فوج سے ہے۔ توریت میں اس موقع پر یہ ہے:

"تب سارے اسرائیل بزرگ جمع ہوکر رامہ میں شموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے"

(۱۔ سموئیل ۸ : ۴، ۵)

اسرائیلی تصور بادشاہی میں فوج کی سرداری لازمی تھی، اور یہ درخواست گزار سب مذہبی لوگ تھے، ملک گیری وکشورکشائی مقصود نہ تھی، جنگ فی سبیل اللہ مقصود تھی۔ نُقَاتِلۡ

کے ساتھ قید فِی سَبِیلِ اللّٰہِ کی درخواست ہی میں لگی ہوئی تھی اور یہ نہیں کہ خود جس کو چاہیں خود رائی سے سردار مقرر کرلیں۔ پیمبر وقت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست اُن سے کی، کہ وہ امیر جیش کسی کو مقرر کریں۔

مذہبیت اور دینی ذہنیت کے ان مظاہروں کے باوجود پیمبر نفسیت بشری سے بھی خوب واقف تھے اور اپنی قوم کی نفسیت سے تو شاید کچھ اور زیادہ ہی۔

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا

"بولے کہ کہیں یہ تو نہیں کہ تم پر قتال فرض کر دیا جائے اور پھر تم قتال نہ کرو"

بلکہ کلمۂ ھَلْ سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سموئیل یہی کچھ سمجھ بھی رہے تھے

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا ؕ (آیت)

(قوم والے) "بولے کہ ہمارے لئے کیا ایسا باعث ہو سکتا ہے کہ ہم قتال نہ کریں خدا کی راہ میں بلکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے نکالے بھی جا چکے ہیں۔"

یعنی یہ بھی کوئی بات ہے کہ خود ہی آپ سے جنگ کا تقاضہ کرنے آئے ہیں اور جب اس کا حکم صادر ہو جائے گا اور جہاد فریضہ مذہبی خدا کی راہ میں تو اس حکم کے بعد اس کی تعمیل سے جی چرانے لگیں۔ خصوصاً جب کہ ہم کو ان کے ہاتھوں اتنے جانی و مالی نقصان بھی اُٹھانا پڑ چکے ہوں! ــــــ لیکن بات آخر ان کے پیمبر ہی کی سچی نکلی۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ؕ

"لیکن جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو وہ اب نکل گئے بجز ان میں سے تھوڑوں کے۔"

ان کے قدیم ترین مورخ جوزیفس کی Antiquities of The Jews میں ہے:-

"ان پر دہشت طاری ہو گئی یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے۔ بعضوں نے زیرِ زمین غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دریائے یردن عبور کر گئے" (باب ۶ فصل ۶ فقرہ ۱)

اور اس حقیقت سے اندھے رہے کہ :۔

وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ (آیت ۲۴۶) اللہ خوب واقف ہے ظالموں سے'۔ اپنے نافرمان بندوں اور ان کی سزا پر بھی ہر طرح قادر ہے.

اس کے بعد کیا ہوا؟ اسے بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیئے :۔

وَقَالَ لَھُمْ نَبِیُّھُمْ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا (آیت ۲۴۷)

"ان کے پیمبر نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ نے تم پر طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے"۔

یہ طالوت کون اور کیا تھے؟ نبی اور رسول کچھ نہ تھے محض امیر جیش تھے اور تاریخ نے ان کو اسرائیل کا پہلا بادشاہ تسلیم کیا ہے۔ زمانۂ حکومت سنہ ۱۰۲۵ قبل مسیح سے لے کر سنہ ۱۰۱۲ قبل مسیح تک۔ توریت میں اس کا نام (Saul) ساؤل کر کے آیا ہے توریت میں حسب معمول بڑی طوالت بیان کے بعد ہے :۔

"سو جب سموئیل ساؤل سے دوچار ہوا تو وہیں خداوند نے کہا کہ دیکھ یہی شخص ہے، جس کی بابت میں نے تجھ سے کہا تھا کہ یہی میرے لوگوں پر ریاست کرے گا" (۱۔ سموئیل۔ ۹۔ ۱۵ — ۱۶)

اب اور آگے سنیئے۔ سموئیل نبی اپنی اُمت کے کیسے رمز شناس تھے، ان کی فراست توقع سے بھی بڑھ کر ٹھیک نکلی. کہاں تو تقاضہ پر تقاضہ تھا کہ امیر جیش کا انتظام ہو جائے اور اب جب خدائی انتخاب کے واسطے سے ہو گیا، تو لگے کہنے، واہ یہ بھی کوئی انتخاب ہو سکتا ہے۔

قَالُوْا اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْہُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ (آیت ۲۴۷)

"بولے اس کو ہمارے اوپر امیری کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم امارت کے حقدار اس سے بڑھ کر ہیں اور نہ اسے مال ہی میں وسعت دی گئی ہے"۔

طالوت کی جو حقارت اسرائیلیوں کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی تھوڑی سی شرح تاریخ کی زبانی بھی سن لیجیے۔

اسرائیلی بارہ قوموں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں سب سے چھوٹا قبیلہ بن یامین کا تھا، اور طالوت اتفاق سے اسی قبیلہ کے تھے، تو ایک باعث ان کے حقیر سمجھے جانے کا یہ نکل آیا۔ نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے، تو ہندوؤں کی طرح ذات پات، بلکہ چھوت چھات کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوؤں کے برہمن اور چھتری کی تفریق و امتیاز کی طرح اب اسرائیلیوں کا بھی عقیدہ یہ قائم ہو گیا تھا کہ نبوت حق مخصوص ہے بنی لاوہ کا اور حکومت حق مخصوص ہے بنی یہوداہ کا ـــ یہود کا قول تھا کہ طالوت، نہ اس میں نہ اس میں، پھر حاکم یہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہندو عوام کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی شخص، نہ برہمن نہ چھتری وہ حاکم اعلیٰ یا سردار کیسے تسلیم کر لیا جائے۔؟

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ برہمن یا چھتری نہیں ہیں نہ سہی، یہ ویش بھی تو نہیں۔ مہاجن یا ساہوکار طبقہ کے بھی تو نہیں، جاہ و مرتبہ میں نہ سہی، کم سے کم مال و دولت ہی میں ہمارے عوام سے ممتاز ہوں! منصب امارت کے لائق تو مالی اعتبار سے بھی نہیں!

مکالمہ میں آپ سامعین و حاضرین کا دل لگ رہا ہے؟ اب نبی وقت کا بیان بھی سنیے۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (آیت ۲۴۷)

"فرمایا کہ اسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں انتخاب کر لیا ہے، اور اسے علم

اور جسم (دونوں) میں کُشادگی زیادہ دی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے
اسے اپنا ملک دے دیتا ہے"۔

آپ نے پہلا اور اصلی جواب تو یہی دیا کہ یہ انتخاب اللہ کا کیا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر طرح پُر حکمت و پُر مصلحت بھی ہوگا، بندوں کے ذہن بھی ان باریک مصلحتوں تک نہیں پہونچ سکتے

توریت نے اسے یوں ادا کیا ہے:

> " اور سموئیل نے جماعت کو کہا کہ تم اسے دیکھتے ہو، کہ جسے خدا نے چُن لیا، تو اس کی مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں (۱ سموئیل۔۱۰-۲۴)

اور دوسرا جواب عقلی قسم کا یہ دیا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو اور تمہارے معیار سے بھی سردار فوج میں بس یہی دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اسے سپہ داری اور ملک گیری کے فنون سے واقفیت ہو، سو وہ طالوت کو حاصل ہے، دوسرے خود اس کی جسمی وجاہت و توانائی، اسکی اہمیت اس زمانہ کی دست بہ دست لڑائیوں میں مسلّم تھی اور طالوت اس میں بھی ممتاز تھے۔

فِی الۡعِلۡمِ سے مراد سیاق میں علوم ملک گیری و ملک داری کے ہیں، ابن عباسؓ نے کہا ہے ای علم الحرب اور روح المعانی میں ہے من حرفة الامور السیاسیة۔

فی الجسم مراد ہے کہ قد و قامت اور وجاہت ظاہری میں طالوت دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں ای فی الطول والقوة۔

توریت کی دی ہوئی تفصیلات سے طالوت کے حلیہ کا نقشہ ذہن میں جما لیجئے۔

> " بہت خوب جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زائد خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ یہ ساری قوم میں کاندھے سے لے کر اوپر تک ہر ایک سے اونچا تھا" (۱۔سموئیل ۹-۱)

ایک دوسری جگہ:۔

"اور وہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے لمبا تھا" (۱۔ سموئیل۔ ۱۰= ۱۳)

اور یہ درازقامتی، اسرائیلیوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لئے تھی، توریت کے بعد مقدس ترین نوشتہ ان لوگوں کے ہاں تلمود ہے۔ ذرا اس کی تصریح ملاحظہ ہو:

"خداوند تبارک وتعالےٰ اپنی سکینت کا نزول صرف اسی شخص پر کرتا ہے جو دانشمند ہو مضبوط ہو، اور درازقامت ہو" (EVERY MAN'S TALMOOD ص ۱۲۸)

قرآن مجید کی اس نکتہ رسی کی داد دیجئے کہ اس نے نام ہی ایسا رکھا جس سے طول قامتی کی طرف پورا اشارہ ہو رہا ہو۔ ہمارے ہاں کے اہلِ تحقیق کا گروہ اسی طرف گیا ہے۔

چنانچہ صاحبِ معالم نے کہا ہے کہ کان طالوت اسمہ بالعبرانیۃ ساؤل فسمّی طالوت بطولہ۔ اور روح المعانی میں ہے، قال انہ عربی من الطول واصلہ الطولوت۔

یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ، اس کی مِلک تو ہر مُلک ہے وہی اپنا ملک جس کو چاہے دے دے۔ وہی ہر طرح مالک ومختار ہے اور آیت کا توڑ ان مختصر سے لفظوں پر ہوا ہے۔

وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ جسے اُردو میں یوں کہیے کہ اس کا اختیار بھی غیر محدود اور اس کا علم بھی محیط کل ـــــــ وہ بڑی ہی وسعت والا ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہی ہر پست کو بلند اور ہر ادنیٰ کو سرفراز کر دینے والا ہے اور اس کا علم بھی محیط وکامل ہے، وہی تو واقف ہے کہ کون ملک داری اور ملک گیری کی صلاحیت رکھتا ہے۔

نبی اپنی اُمت کی اعجوبہ پرستی اور خوارق پسندی سے واقف تھے، جوابات تو

ان کے اعتراض کے معقول وکافی دے چکے تھے، پھر بھی کچھ دیر مغز پاشی ضروری مناسب معلوم ہوئی۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آیت ۲۴۸)

"ان کے نبی ان سے بولے، کہ اس کی امارت کا نشان (یعنی جو تمہارے اطمینان کا کام دے سکے) یہ ہے تمہارے پاس وہ صندوق (از خود) آجائے گا۔ جس کے اندر تمہاری تسکین کا سامان تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی، جنھیں آل موسیٰ وآل ہارون چھوڑ گئے ہیں، اسے فرشتے لے آئیں گے۔ بیشک اس واقعہ میں تمہارے لئے نشانی ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو۔"

تقریر میں تابوت سکینہ ایک تشنہ طلب لفظ آگیا ہے۔ اس تلمیح کو آپ بھی سمجھ لیجیے تو گتھی بالکل کھل جائے اور بات خوب روشن ہوکر رہے۔

یہ اصطلاحی نام ایک خاص تابوت کا ہے، جو بنی اسرائیل کا اہم ترین قومی وملی ورثہ تھا اس کے اندر اصل نسخہ توریت کا تھا، اور انبیاء بنی اسرائیل کے تبرکات محفوظ تھے، اسرائیلی اس کو برکت وتقدیس کی متاع عزیز سمجھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے۔ سفر وحضر، جنگ وامن ہر حال میں اسے بڑی عزت وحفاظت کے ساتھ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اپنی ساری خوش بختی اس کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے۔ یہ صندوق کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علمائے یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش یہ تھی: طول ۲½ فٹ، عرض ۱½ فٹ، بلندی ۱½ فٹ۔ مدت دراز ہوئی فلسطینی ایک جنگ میں

ان سے یہ چھین لے گئے تھے، اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست اور بدطالعی سمجھ، اس کی بازیابی کے لئے نہایت درجہ مضطرب و پریشان تھے۔ طالوت کے وقت میں اس کی واپسی کے بعد یہ تابوت ان کے قبضہ میں حضرت سلیمان (متوفی سنہ ۹۳۲ ق، م) تک رہا، اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسے بھی اسی میں رکھ دیا تھا، اس کے بعد سے پھر اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن کر دیا گیا ہے۔

قرآنی لفظ سَکِیۡنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ سے خصوصی اشارہ توریت شریف کے نسخہ شفا کی جانب ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کی چھوڑی ہوئی چیزوں سے مراد ان دونوں پیمبروں اور ان کی بزرگ اولاد کے تبرکات و آثار ہیں۔

تاریخ یہود کا بیان ہے کہ فلسطینی اس مقدس تابوت کو چھیننے کو تو چھین لائے۔ لیکن جب سے ایک دن بھی چین سے نہ بیٹھنے پائے۔ ابھی وبا کا زور ہے۔ ابھی کوئی اور مصیبت، آخر عاجز آکر یہ طے کیا کہ خود تابوت یعنی اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھنکوا دیا جائے۔ چنانچہ ایک بیل گاڑی پر اسے لاد کر بغیر گاڑی بان کے یوں ہی ہانک دیا۔ بیل سیدھے علاقۂ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہو گئے اور گاڑی اُن کے شہر بیت شمس میں آکر ٹھہر گئی۔

تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ کی خبر کو حیرت کے کانوں سے نہ سُنیئے۔ ایسے موقعوں کے لئے ہمیشہ یہ نکتہ حافظہ میں رکھیئے۔ کہ تکوینی تصرفات جب بھی حکم الٰہی سے ہوتے ہیں، کیا معمول کے موافق کیا معمول سے الگ، ہمیشہ فرشتوں ہی کے ذریعہ سے ہوتے ہیں اور کلام الٰہی میں ہر فعل و عمل کے لئے محاورہ فرشتوں ہی کا استعمال ہوتے ہیں۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل فرشتے ہی لاتے ہیں۔ آندھی کے جھکڑ فرشتے ہی چلاتے ہیں، قحط، وبا، زلزلے سب فرشتوں ہی کی معرفت ظہور میں آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی

بیلوں کا رُخ اسرائیلی علاقوں کی جانب پھیر دینا فرشتوں ہی کا کام تھا۔ یہ ایک غیبی نشان تھا، طالوت کی تائید میں، اور مبارک فال تھی اس کے حق میں۔ اس حیرت انگیز واقعۂ بازیابیٔ تابوت کی طرف اشارہ کرکے نبی وقت اپنی اُمت سے کہتے ہیں کہ تمہارے اطمینان کے لئے تصرف غیبی کا ثبوت موجود ہو گیا۔ اس قیل و قال اور مذاکرے اور مکالمے کے بعد، جب اُمت طالوت کی کمان میں، قتال پر آمادہ و مستعد ہو گئی تو خود سردار جیش کو ایک ضرورت گفتگو کی فوج والوں سے پیش آ گئی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ (آیت ۲۴۹)

"جب طالوت فوج والوں کو لے کر آگے بڑھے تو بولے کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ لینا چاہتا ہے"۔

جس دریا کا ذکر ہے وہ فنا نہیں ہو گیا ہے، آج تک موجود ہے، اس کا نام یردن، انگریزی تلفظ میں (Jordon) کوئی بڑا دریا نہیں، کہنا چاہیئے کہ منبع سے دہانہ تک براہ راست لمبائی کُل، ۱۳۰ میل کی۔ البتہ درمیانی پیچ و خم ملا کے لمبائی کی میزان کوئی تین سو میل تک پہونچ جاتی ہے۔ علاقۂ فلسطین میں گویا اہم ترین دریا یہی ہے۔ اور علاقہ کی قدرتی سرحد کا کام بھی یہی دیتا ہے۔ چنانچہ دریا کے اِس پار اور اُس پار (اِس ورے اور اُس ورے) کے علاقوں کی تقسیم خود توریت میں موجود ہے۔ اور یہ ذکر صحیفۂ یوشع کے باب اول کی آیات ۱۲-۱۵ میں ہے۔ اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی جانب ہے اور بحر جلیل (Sea of Galilee) اور بحر طبریہ (Sea of Tiberiya) ہوتا بحر المیت یا بحر مردہ (Dead Sea) میں جا گرتا ہے۔ پانی شروع کے حصہ میں صاف و شفا بخش و شیریں ہے۔ لیکن آگے چل کر گندلا، بدبودار اور مضر صحت ہو جاتا ہے۔

تو تمہارے صبر و ضبط (ڈسپلن) کا امتحان، مشیت و حکمت الٰہی سے اسی دریا

کے ذریعہ ہوگا۔

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ج

" پس جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ

" اور جو کوئی اسے نہ چکھے گا وہی میرا ہے، ہاں کوئی ان میں چلو بھر اپنے ہاتھ سے پی لے (تو اس کا مضائقہ نہیں)

" میرا نہیں ہے " سے یہ مراد نہیں کہ وہ میرے دین و کیش سے خارج ہے، بلکہ مراد یہ کہ میری فوجی اطاعت سے باہر ہے، اور میرے قائم کئے ہوئے ڈسپلن کا پابند نہیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ موسم گرمی کا تھا اور سپاہیوں کو پیاس زور کی لگی ہوئی تھی۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اصل حکم تو وہی ملا تھا کہ کوئی بھی راستہ میں یہ پانی زبان پر نہ رکھے۔ اور یہ دوسرا حکم بہ طور رخصت و اجازت تھا، کہ خیر ایک آدھ چلو سے منہ تر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ــــــ باقی قصہ آگے سنئے:

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ط ۔ " لیکن پانی سب نے اس سے پی لیا، بجز ان میں چند آدمیوں کے "

یعنی خلاف حکم اچھی طرح سیر ہو کر پی لیا۔ جس کے بعد چلنا خصوصاً فوجی مارچ کرنا قدرتاً دشوار ہو گیا۔ باز رہنے والوں کی تعداد جو قرآن نے تھوڑی ہی بتائی ہے، وہ حسب روایت توریت تقریباً چھ سو تھی " تب سمویل نے ان لوگوں کو جو اس کے پاس حاضر تھے گنا اور وہ مرد قریب چھ سو کے تھے (۱۔ سمویل ۔ ۱۲ = ۱۵)

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ط (آیت ۲۴۹)

" پھر طالوت اور جو مؤمنین ان کے ساتھ تھے، دریا کو پار کر گئے، تو وہ لوگ

بولے آج تو ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی سکت نہیں"۔

جالوت فلسطینیوں کے لشکر کا سردار بڑے تن و توش کا پہلوان تھا۔ انسان کا ہے کو تھا، اچھا خاصا دیوزاد تھا۔ توریت میں اس کی جسامت، قد و قامت، اسکی شہ زوری اس کے ہتھیار، ان سب کی تفصیلات موجود ہیں، ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قد دس فٹ کا تھا، بجز چہرے کے سر سے پیر تک آہن پوش رہتا تھا؛ اور اس کی سپر کا وزن کوئی تین من کا تھا۔

دشمن کو اپنے سے قوی و زبردست پاکر اچھے اچھے ایمان والوں کی ہمت طبعی طور پر جواب دے جاتی ہے۔ جوزیفس اسرائیل کی تاریخ آثار یہود میں ہے کہ طالوت اور اس کے لشکری یہ سامان دیکھ کر سہم اٹھے" (باب ۶ - ۹ = ۱۰)

اور خود توریت کا بیان ہے۔

"جس وقت ساؤل اور سارے اسرائیل نے اس فلسطینی کی بات سنی تو ان کی دلاوری نکل گئی، اور وہ نہایت ڈر گئے" (۱۔ سموئیل - ۱۷ - ۱۱)

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا اللَّهِ ۙ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (آیت ۲۴۹)

"وہ لوگ جنھیں یقین تھا کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، بولے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

طالوت کے لشکر میں مومن تو سبھی تھے، لیکن بہتوں پر دشمن کے ظاہری ساز و سامان کی دہشت طاری ہو گئی، اور طبعی طور پر اس کی شان و شوکت سے مرعوب ہو گئے۔ البتہ کچھ ایسے بھی تھے جن میں آخرت کا عقیدہ تر و تازہ اور مستحضر تھا، وہ اس وقت پر

بھی اپنے ایمان پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور ذرا بھی متزلزل نہ ہوئے اور حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ صابرین کا ساتھی ہے۔ اس کی نصرت و توفیق انھیں لوگوں کے ساتھ ہے اور آخرت کا استحضار جن لوگوں میں ہے وہی ان میں جرأت و بے خوفی پیدا کرتا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آیت ۲۵۰)

”جب جالوت اور اس کے لشکریوں کے مقابل آئے تو بولے کہ اے پروردگار ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمادے اور ہمیں غالب کر کافر لوگوں پر۔“

یہ دو آیتیں جو ابھی آپ کے سامنے تلاوت ہوئیں، ان میں عام تعلیم اللہ کے سپاہیوں کو آداب جنگ کی ہے کہ کامل تکیہ سپاہیوں کو بجائے اپنی قوت و شوکت کے نصرت الٰہی پر ہونا چاہیئے۔

قرآن کا بیان تو آپ سنتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ اور توریت کا بیان جس کا جی چاہے، خود توریت میں پڑھ کر دیکھ لے، توریت میں نفس جنگ کے خشک و خارجی واقعات تفصیل قرآن سے کہیں زائد ہے۔ اور وہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی کتاب تذکرہ و تاریخ کی ہے۔ قرآن مجید اس کے برعکس ہر موقع پر تعلیم، اصول توحید اور اخلاق عالی کی دیتا جاتا ہے، اور یہی وہ اس موقع پر بھی کر رہا ہے۔

چنانچہ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا میں سب سے پہلے یہی درخواست کی ہے، کہ ہمیں توفیق صبر و ثبات قلب کی ہو، اور ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا میں صراحت اسی دعا کی ہے کہ ہمیں ثبات قدم نصیب ہو۔ رہی وَانْصُرْنَا کی دعا تو ثبات قلب و ثبات قدم کے بعد دشمن پر ظفر و غلبہ تو شاید بہ طور قدرتی نتیجہ کے حاصل ہو ہی جاتا۔ لیکن مومنین صادقین کی نظر اپنے سارے انتظام اور ساری سعی و تدبیر سے کہیں بڑھ کر نصرت و تائید الٰہی پر رہتی ہے

اور پھر آخر میں صراحت عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کی ہے۔ یعنی جنگ کوئی ملکی یا دنیوی نہیں، دینی و اعتقادی ہے۔ مقابل محض دشمن نہیں، کافر ہیں۔ مقصود فتح اور غلبہ دشمنوں پر نہیں، بلکہ کافروں اور دین کے دشمنوں پر ہے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ (آیت ۲۵۱)

"پھر انھوں (طالوت والوں) نے انھیں (جالوت والوں کو) شکست دیدی، اللہ کے حکم سے اور جالوت کو داؤد نے قتل کر ڈالا۔"

بِاِذْنِ اللّٰهِ کی قید ملاحظہ رہے۔ اذن توفیق کے معنی میں ہے۔ مقبولین کا کوئی سا بھی کارنامہ ہو، اس قید سے پیچھا چھوٹنے نہیں پاتا یاد دہانی ہر جگہ ہوتی رہتی ہے۔ کہ بندہ بیچارا کیا کرے گا۔ جب کچھ بھی اس سے بن پڑتا ہے، تائید و توفیق حق ہی سے ہوتا ہے۔ جنگ و ترتیب جنگ کی منظر کشی توریت میں بھی ہے لیکن بس وہی فکری نقطۂ نظر سے

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ ۔ دشمن کے بطل جلیل اور سردار اعظم جالوت کی ہلاکت داؤد کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ داؤد کون تھے؟ آگے چل کر تاریخ اسرائیل کے ایک نامور ہیرو ہوئے۔ ملک و سلطنت سے سرفراز ہوئے اور نبوت سے بھی۔ اس وقت لشکر طالوت کے ایک عام سپاہی تھے، زمانۂ حکومت سنہ ۱۰۱۲ ق۔ م سے سنہ ۹۷۲ ق م تک رہا۔

قرآن مجید میں آپ کا ذکر چھ مرتبہ آیا ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس نوعمر سپاہی نے ایک پتھر اپنے فلاخن میں رکھ کر ایسا اُس کے کھینچ کر مارا کہ پتھر اس کے ماتھے کو توڑتا ہوا اس کے دماغ کے اندر پیوست، ہو گیا اور جالوت تڑپ کر مثا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ (آیت ۲۵۱)

اور اللہ نے اسے حکومت عطا کی اور حکمت بھی اور اسے سکھلایا جو کچھ کہ چاہا۔

یہ بادشاہی ایک خدائی عطیہ تھی۔ پہلے تو قرآن نے اسی کو صاف کیا ہے کہ یہ فرمانروائی ان کے واسطے سے قوم اسرائیل کو عطا ہوئی تھی۔ آپ نسل اسرائیل کے دوسرے تاجدار ہوئے ہیں

پہلے تاجدار طالوت تھے اور آپ ان کے داماد بھی تھے۔ طالوت جب اپنے بڑے فرزند کے ساتھ میدان جنگ میں کام آگئے تو قبیلہ یہودا نے آپ کو بادشاہ منتخب کیا اور دو سال کی کشمکش کے بعد قوم کے باقی قبیلوں نے بھی آپ ہی پر اتفاق کر لیا۔ سات سال تک آپ نے پایۂ تخت ہبرون (Hebron) کو رکھا۔ اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے چھڑا کر اسے اپنا دار السلطنت بنایا۔ گرد و پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا۔ اپنے حدود سلطنت کو خوب وسیع کیا۔ آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات اور حسن انتظام کے لحاظ سے یادگار ہے۔

وَالْحِكْمَةَ حکمت کے لفظی معنی دانائی کے ہیں۔ یہاں مراد نبوت ہے، جو خود انتہائی نام دانائی کا ہے عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ علوم انبیاء کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ مِمَّا يَشَآءُ کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون و صنائع آگئے جو آپ کو تعلیم ہوئے تھے۔

قصۂ طالوت طویل ہو کر بیان ہوا۔ آخری آیت کا آخری ٹکڑا بطور ضمیمہ یا تکملہ کے ہے اور اسی میں قصہ کا خلاصہ بھی آگیا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ٥ (آیت ۲۵۱)

اور اگر اللہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو روئے زمین پر فساد برپا ہو جاتا۔ لیکن اللہ تو جہان والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے

اس لئے اللہ اپنے فضل و کرم سے اس فساد عظیم کی نوبت نہیں آنے دیتا اور بدکاروں کو نیک کاروں کے، اور نافرمانوں کو فرمانبرداروں کے ذریعہ ہٹاتا اور مٹاتا رہتا ہے لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بدی و بدکاری سے روئے زمین پر فساد عظیم برپا ہو کر رہتا۔

یہاں یہ عام قانون بتا دیا گیا کہ دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوا کرتے ہیں یہ یونہی بلا ضرورت و مصلحت محض گردش گردوں سے نہیں ہو جایا کرتے بلکہ ہمیشہ بامقصد

پرحکمت ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور ان سے ظلم وطغیان وعصیان کی اصلاح بدنظر ہوتی ہے اور یہیں اس حقیقت پر بھی روشنی پڑجاتی ہے کہ اس عالمِ اسباب میں مشیت تکوینی جو کام بھی لیتی ہے: بندوں ہی کے ذریعہ وواسطہ سے لیتی ہے اور روئے زمین پر فساد عظیم کے برپا ہوجانے پر جو شے روکے ہوئے ہے وہ اللہ کا فضل عظیم ہی ہے۔

یاد کر لیجیے اس لمبے قصے کے ذرا قبل حکم جہاد کا ملا تھا، اور ترغیب قتال کی شروع ہوئی تھی، طریق جہاد، آداب جہاد، متعلقات جہاد کے سلسلے میں کتنی ہدایتیں کتنی بصیرتیں اس ایک تاریخی قصہ کے ضمن میں فراہم ہوگئیں۔

(٢٦)

اس قصہ کے خاتمہ پر معاً روئے سخن براہ راست صاحب قرآن کی طرف ہوجاتا ہے اور آپ سے مخاطب ہوکر ارشاد ہوتا ہے۔ :

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ (آیت ٢٥٢)

یہ اللہ کی آیتیں ہیں کہ ہم انھیں آپ کو (اے رسول) پڑھ کر سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک۔

بِالْحَقِّ یعنی غرض صحیح کے ساتھ اور بالکل بے کم وکاست۔ یہ گویا پرزور اعلان اس کا کہ صحیح ومستند بیان قرآن ہی کا ہے۔ یہ نہیں کہ دوسری الہامی کتابوں اور مذہبی نوشتوں کی طرح کے قصے ادھورے یا مبالغہ آموز یا مسخ شدہ ہوکر رہ گئے ہوں۔ اور اس کی ایک واضح مثال یہ قصۂ طالوت ہی ہے۔ بائبل والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (آیت ٢٥٢)

تو آپ یقیناً فرستادوں میں سے ہیں۔

آپ اپنے پیغمبر برحق ہونے میں اصلاً شک وشبہ نہ کیجئے۔ اور حقائق کا نزول برحق پیمبروں ہی پر ہوتا ہے۔ لفظ الْمُرْسَلِينَ کی معنویت قابل غور ہے، انبیاء کی حیثیت اسلام میں تمام تر قاصدوں، سفیروں، فرستادوں اور بھیجے ہوؤں کی ہوتی ہے اور جو مرسل (بھیجا ہوا) ہوتا ہے وہ کسی کی طرف سے کسی کے پاس ہی بھیجا ہوا ہوتا ہے یہ مرسلین یا پیامبر نہ اوتار ہوتے ہیں نہ دیوتا، نہ خدا کے مظہر ہوتے ہیں۔ نہ خدا ان کے اندر حلول کئے ہوتا ہے۔ معبودیت یا نیم معبودیت کی صلاحیت ان میں ذرا بھی نہیں ہوتی۔ اللہ اکبر! ـــ شرک بلکہ شائبہ شرک سے بچنے کا بھی قرآن مجید کو کتنا اہتمام ہے الفاظ تک کے انتخاب میں وہ اس کا کیسا لحاظ رکھتا ہے۔

لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ کی ترکیب سے یہ بھی نکل آیا کہ آپ دنیا سے نرالے یا انوکھے کوئی مرسل نہیں بلکہ آپ اس زمرۂ مرسلین کے ایک فرد ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔

﴿۲۷﴾

اور اس سلسلے میں یہ مسئلہ بھی کس خوبی سے حل کر دیا ہے۔ کہ پیمبر پیمبر سب یکساں مرتبۂ عظمت و احترام کے نہیں ہوتے۔ گو احترام مشترک سب میں رہتا ہے۔ بادشاہ کے صوبہ داروں میں تفاضل بھی پایا جاتا ہے، گو فضیلت سب میں مشترک ہوتی ہے اور شرف تقرب سے کوئی خالی نہیں ہوتا

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ (آیت ۲۵۳)

اور رسولوں میں ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دے رکھی ہے۔

فَضَّلْنَا میں ضمیر جمع متکلم کا خیال رہے۔ یہ تفضیل و افضلیت جو کچھ ہے، وہ محض عند اللہ ہے، خالق کے ہاں درجات و مراتب قرب کے اعتبار سے ہے۔ خلق کے لئے بہ حیثیت مطاع و مقتدا سب یکساں ہیں۔ اکرام و تعظیم سب کی واجب ہے (اور اسی

معنی میں قرآن مجید کی ایک دوسری آیت کا جزو اسی پارے کے اندر لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ آرہا ہے) چنانچہ:

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ

انھیں میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے (براہ راست بلا واسطہ ملائکہ) جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ موسیٰ کلیم اللہ کے لئے آیا

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ط اور کسی کے اُن میں سے درجے بلند کئے ہیں، جیسے ہمارے رسول سرور انبیاء، جامع کمالات، و خاتم النبوت تھے مفسر زمخشری نے یہ خوب کہا ہے کہ جہاں شناخت و تعیین میں کوئی دقت نہ ہو، وہاں کنایہ صراحت سے بڑھ کر بلیغ و مؤثر ہوتا ہے:

وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ
بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط (آیت ۲۵۳)

اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے شواہد عطا کئے اور ہم نے ان کی تائید کی روح القدس کے ذریعہ (کہ وہ بھی انھیں پیمبران برحق میں سے تھے)

ابْنَ مَرْیَمَ ۔ یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند، نہ ابن اللہ یا کچھ اور۔ عیسیٰ علیہ السلام بہ ایں مرتبہ و جلالت بہرحال ایک بشر ہی گوشت و پوست کے بنے ہوئے اور انسانی شکل و صورت رکھنے والی ہی عورت کی اولاد تھے، نہ خدا تھے نہ خلازادے، نہ الوہیت کا کوئی شائبہ اپنے اندر رکھتے تھے، انھیں خدا کا بیٹا ٹھہرانا بڑی جہالت تھی، اور اسی لئے تو ضرورت پیش آگئی انھیں صراحت کے ساتھ ابن مریم کہنے کی، کہ محض اسی نشان دہی سے اور اسی پتے ہی سے ضرب لگ جائے عقیدۂ نصرانیت پر، ورنہ قرآن نے اتنے پیمبروں کا ذکر کیا ہے، کسی کا تعارف یہ کہہ کر نہ کرایا کہ فلاں ابن فلاں۔ اس طرح کا تعارف مخصوص ہے ابن مریم کے لئے۔ کہ انھیں کے لئے تو عقیدۂ ابن اللّٰہیت کی تردید کی

ضرورت تھی بہ الْبَیِّنَاتِ یعنی شواہد، ان کی حقانیت و پیمبری کے۔ اور اس کے تحت وہ دلائل و خوارق سب ہی آگئے جنھیں دیکھ کر ہر عقل سلیم نبوت عیسوی کی قائل ہو جائے ابھی تردید ہو رہی تھی شرک نصرانیت کی، اب تردید ہو رہی ہے الحاد یہودیت کی۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پیمبر برحق اور مؤید من اللہ تھے۔ نہ کہ نعوذ باللہ شعبدہ باز یا بازی گر، نصرانیوں نے جس طرح غلو و افراط کر کے آپ کو حد عبودیت سے اُونچا اچھال دیا تھا۔ اسی طرح یہود نے عناد و تفریط سے کام لے کر آپ کو بازی گر و شعبدہ باز قرار دے دیا تھا۔ امر حق اور قول فیصل اب قرآن کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔

وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کہ روح القدس قدم قدم پر آپ کی محافظت و مدافعت دشمنوں سے کرتے تھے۔

یہ روح القدس عیسائی تثلیث والے کوئی اقنوم نعوذ باللہ نہ تھے۔ بلکہ اسلامی اصطلاح میں یہ لقب ہے فرشتۂ اعظم حضرت جبریل کا، جبریل ملکوتی مخلوق ہیں عند اللہ نہایت مقرب۔ لیکن بہر حال مخلوق ہی ہیں، اور کوئی بھی شائبہ الوہیت کا اپنے اندر نہیں رکھتے۔

وَاَیَّدْنٰہُ ان کی تائید ہم نے کی، جو قادر علی الاطلاق ہیں، اور یہ تائید کوئی خود بخود تو نہیں مل گئی۔ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عیسیٰ مسیح بہ ایں ہمہ فضائل و کمالات بہر حال انسان ہی ہیں۔ انسانوں کی طرح دفع ضرر اور حصول نفع دونوں کے لئے دستگیریٔ حق کے محتاج۔ اور قدرت کاملہ نے ان کی حفاظت، رفاقت، و تقویت کے لئے ڈیوٹی ایک دوسری مخلوق لطیف و غیر مرئی جنس کی لگا دی!

(۲۸)

آیت الکرسی کی مشہور آیت سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کی تمہید کی آیت ہے:۔

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ

اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (آیت ۲۵۴)

اے ایمان والو جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو اللہ کی راہ میں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ تجارت کام آئے گی نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔

انفاق یعنی صرفِ مال کا ذکر سیاق مدح میں جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں آتا ہے، ظاہر ہے کہ نیکی یا راہ خدا ہی میں آتا ہے۔ اس کے لئے یہاں یہ پہلے ہی کتنی بار یاد دہانی کر دی گئی ہے کہ جس مد میں بھی خرچ کرو گے، وہ آمدنی آئی کہاں سے ہے۔ بہر حال اللہ ہی کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ تو اس مال عطیۂ الٰہی کو اسی دنیا میں نیک کاموں میں قبل قیامت خرچ کر دو، اور قیامت کا نام بجائے صراحت سے لینے کے اس کا تعارف ان علامتوں سے کرایا ہے، کہ

(۱) اس دن کسی طرح کی سودا بازی، لین دین، خرید و فروخت نہ ہو سکے گی،

(۲) اور نہ کوئی محبت و دوستی اور قرابت داری کا رشتہ چل سکے گا،

(۳) اور نہ کسی بڑے شخص کی سعی و سفارش، اس کی وجاہت، مروت یا دباؤ کی بناء پر قابل قبول ہو گی،

لیکن نفی صراحت کے ساتھ ان تین مدوں کی کیوں؟ وجہ یہ کہ یہی تین گمراہیاں تو شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ گمراہ قوم اول تو حشر و یوم حساب کی قائل کہاں تھیں؟ اور جو اہل کتاب کے اثر سے، یا خود اہل کتاب قومیں، تھوڑی بہت اس کی تھیں بھی، تو طرح طرح کی پخیں عجب عجب لگا رکھی تھیں، کہیں عقیدہ تھا کہ اہل ثروت تو وہاں بھی مالدار ہوں گے۔ اپنی بدیاں کچھ دے دلا کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینگے اور ان کی نیکیاں کچھ خرچ کر کے اپنی طرف منتقل کر لیں گے۔ اور کہیں یہ عقیدہ تھا کہ

دوستی عزیز داری کی بنا پر سیہ کاریاں حسنات میں تبدیل ہو جائیں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ عقیدہ پھیلا ہوا تھا کہ فلاں فلاں بزرگ آباواجداد مقبول و مقرب اپنی سفارش کے ذریعہ اپنی اولاد کو، یا اپنے جاننے والوں کو چھڑا لائیں گے۔ یہ آخری فتنہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور دین نصرانیت کی بنیاد ہی ان دو عقیدوں پر ہے۔ ایک عقیدۂ کفارہ، جس کے معنی یہ ہیں کہ ابن اللہ نے ساری دنیا کے گناہگاروں کی طرف سے فدیہ یا کفارہ بن کر اپنی جان سولی پر دے دی۔ اور دوسرا عقیدۂ شفاعت، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح ابن اللہ کا مستقل منصب شافع مطلق کا ہے۔ عرش الٰہی پر متمکن یہی کئے جائیں گے اور بے دریغ شفاعت کرکے اپنے ماننے والوں کو نجات دلواتے جائیں گے۔

اسلامی شفاعت جو ہے، وہ کوئی مستقل شفاعت ہی نہیں بلکہ ایک صورت مقبولین کی دعا کی ہے۔ مقبولین حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ایما پاکر درخواست کریں گے، دعا کریں گے کہ فلاں فلاں کے قصوروں کو، خطاؤں کو نظر انداز کرکے انھیں مغفرت سے نواز دیا جائے۔ اور یہ دعا ان لوگوں کے حق میں قبول ہو گی۔ چنانچہ اسی آیت الکرسی کے دوسرے ٹکڑے میں ہے!

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

کون ایسا ہے جو اللہ کے آگے شفاعت کر سکے، ہاں سوا اس کے کہ اسی کی اجازت سے ہو۔

یعنی شفاعت تو تمام تر حق، حق تعالیٰ ہی کا ہے لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ہاں وہی خود جس کسی کو چاہتا ہے اس کا مجاز کر دیتا ہے اور بہ ظاہر اس کی درخواست قبول کرکے اس کا اعزاز سب کی نظر میں دوبالا کر دیتا ہے۔

جاہلی اور نیم جاہلی قوموں کی گمراہیاں اگر پوری طرح نظر میں ہوں تو ان آیتوں کی قدر و قیمت اور معنویت نظر میں خوب رچ جاتی ہیں۔

(۲۹)

بزرگ آیت الکرسی اور اس کے بزرگ ملحقات سے گزر کر اب آپ اس مقام پر آتے ہیں جہاں رئیس الموحدین حضرت ابراھیم خلیل اللہ کا مکالمہ و مناظرہ اپنے ایک معاصر بادشاہ سے درج ذیل ہے :۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهِیْمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ (آیت ۲۵۸)

(اے مخاطب) کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جو ابراہیم سے ان کے پروردگار کے باب میں مباحثہ کر بیٹھا اس (شیخی) میں آکر کہ اللہ نے اسے بادشاہت دے رکھی تھی۔

قرآن مجید میں اس بادشاہ کا نام اور پتا نشان کچھ درج نہیں مفسرین نے اس کا نام نمرود لکھا ہے، اور وہ بادشاہ بابل یا کلدانیہ کا تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانے کی تاریخ بہت دھندلی ہے۔ اس لیئے بادشاہ کا صحیح نام اور پتہ اب تک تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکا ہے۔ تو یہ بات کچھ ایسے اچنبھے کی نہیں۔ نمرود ہی خدا معلوم اس کا اصلی نام تھا یا یہ صرف اس کا عربی تلفظ ہے۔ بہر حال اس نام کے ایک بادشاہ کا ذکر توریت میں دو جگہ آیا ہے۔ اور دونوں جگہ سخت ظالم کی حیثیت سے۔ ایک جگہ صحیفہ پیدائش کے باب ۱۰ کی آیت ۹ میں ہے۔

”...... سے نمرود پیدا ہوا۔ وہ زمین پر قہار ہونے لگا اور خداوند کے سامنے وہ قہار و جبار تھا۔“

اور دوسری جگہ صحیفہ ۱۔ تواریخ کے باب ۱ کی آیت ۱۰ میں ہے :۔

”وہ زمین پر جبار ہونے لگا“

اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں روایات یہود کے حوالے سے ہے :۔

"نمرود زمین کا بادشاہ ہوگیا، اور آذر کو اس نے اپنا وزیر بنایا، اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرود خدا سے بیگانہ ہوگیا۔ اور بہت سخت قسم کا مشرک ہوگیا" (جلد ۹ ص ۳۰۹)

اور اتنی صراحت انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ملتی ہے، کہ بابل کی تاریخ میں ایک بادشاہ کا نام آتا ہے، بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا۔ اور بعض مورخین نے اسے نمرود کا بڑا ثبت قرار دیا ہے۔

اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ میں اَنْ لِاَنْ کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ نے جو اسے بادشاہت سے سرفراز کر دیا تھا، یہی اسے کبر و پندار پر لے آیا۔ اور اسی نے اس میں سرکشی اور طغیانی پیدا کر دی۔

اَلَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مباحثہ و مناظرہ شروع اسی نے کیا تھا نہ کہ پیغمبر وقت نے۔

فِیْ رَبِّہٖ اسے ظاہر کر رہا ہے کہ گفتگو باب الوہیت میں نہ تھی، منکر و مشرک فرماں رواؤں کو ٹھوکر باب ربوبیت ہی میں لگی ہے۔ اپنے متعلق الوہیت کا دعویٰ تو شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ دعوےٰ ہے بھی بدیہی البُطلان۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں کلدانیوں کا مذہب اصلاً شمس پرستی کا۔ یعنی سورج دیوتا کی پوجا کا تھا، دوسرے دیوی دیوتاؤں کا سردار یہی تھا۔ اسی کا مظہر یا اوتار عجب نہیں کہ نمرود کلدانی اپنے کو سمجھ رہا ہو۔ اور اہل توحید کو سرکاری مذہب کا دشمن و غدار، اور ایسے خدائے باطل کو اہلِ توحید سے جلن اور جھنجھلاہٹ پیدا ہو جانا قدرتی تھا۔ یہود کے مورخ قدیم جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں ذکر ہے:۔

" لوگوں کی خوش حالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکنے لگا، گویا کہ وہ خود قادر علی الاطلاق تھا، کہتا تھا کہ اگر ایکی خدا نے طوفان نوح کی طرح دنیا کو ڈبویا تو

میں اس سے انتقام لوں گا" (باب اول سیکشن ۱، پیرا ۴ ۔)

اِذْ قَالَ اِبْرٰھِمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (آیت ۲۵۸)

جب کہ ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا خدا وہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔

یہ آپ نے یقیناً اس کے اسی سوال کے جواب میں کہا ہو گا کہ وہ کون سا خدا ہے، جس کے تم پرستار ہو؟ نمرود تو مدعی اپنے رب اور مظہر خدا ہونے کا تھا، اس نے داعی توحید کو چیلنج دے کر پوچھا ہو گا کہ وہ کون سا خدا ہے؟ جس کی طرف تم دعوت دیتے رہتے ہو۔ ذرا اس کے اوصاف تو مجھے سناؤ ——— مشرک افراد آج بھی بڑے اچنبھے سے پوچھا کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں دیوی دیوتاؤں کے علاوہ، اور ان سے ماورا آخر خدا ہے کون سا؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے افعال وصفات کیا ہیں؟ کچھ اس رنگ کے سوال اُس وقت بھی ہوئے ہوں گے۔

آپ نے جواب میں فرمایا ہو گا کہ حیات وموت کی ساری قوتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں وہی ساری نظام ربوبیت کا سرچشمہ ہے، کائنات حیاتی کی بقا و فنا کے سارے قانون اور ضابطے آخر میں اسی پر جا کر ٹھہرتے ہیں۔ کسی ہستی میں بھی یہ طاقت نہیں کہ اس نظام بقائی و فنائی کو بدل دے۔ یا اس میں کوئی ادنیٰ سا تصرف کر دکھائے۔

علم کلام جسے ہمارے غالی صوفیا بڑی حد تک حقارت سے دیکھتے ہیں، بلکہ متکلم کو گمراہ و بددین سمجھتے ہیں تو آپ نے دیکھ لیا کہ اُسے بددینی کے درجہ پر رکھنا کجا، اس کا اثبات تو سُنتِ انبیاء سے ہو رہا ہے!

قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ط

وہ بولا کہ زندگی اور موت تو میں دیتا ہوں۔

بے دین کی عقل ہی کتنی! موت وحیات کے اسباب بعید و خفی کو تو اس نے چھوڑا صرف اسباب سطحی و قریبی کو سامنے رکھ کر بولا کہ سامان معیشت تو سب میرے ہاتھ میں ہے،

جسے چاہوں زندہ رہنے دوں، اور جسے چاہوں بھوکوں مار ڈالوں۔ یا اور جس طرح چاہوں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔

ابراہیم ذکی نے جب دیکھا کہ اتنی موٹی بات بھی مخاطب غبی کی سمجھ میں نہ آئی تو آپ نے ایک دوسرا پیرایہ اور زیادہ عام فہم اختیار کیا۔

قَالَ اِبْرٰهِمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ
فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔

ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا مغرب سے نکال کر دکھا۔

موحد اعظم نے استدلال کو زیادہ قریب الفہم بنانے کے لئے یہ دوسری مثال جھٹ سے پیش کر دی، کہ تو سورج دیوتا کا اوتار بنا پھرتا ہے۔ اور اسی دیوتا کے قادر و متصرف ہونے کا ڈھنڈورچی ہے تو زیادہ نہیں تو ذرا اتنا ہی کر دکھا کہ سورج عام قانون الٰہی سے ہٹ کر، کسی دن ذرا اُرخ اور سمت ہی بدل دے۔ دوسروں پر قدرت و تصرف رکھنا الگ رہا ذرا اپنے ہی اوپر تصرف کر کے دکھا دے۔ تصرف بھی صرف اتنا کہ اپنا رُخ بجائے اِدھر کے اُدھر کر دے ——— آپ نے نفس استدلال وہی قائم رکھا صرف مخاطب کی غباوت اور سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے گویا یہ کہہ دیا کہ اچھا کائنات حیاتی میں نہ سہی، کائنات طبعی ہی کے نظام خلائی میں ایک ادنیٰ تصرف کر کے دکھا دے۔

فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ　　پس جو کافر تھا وہ مبہوت ہو گیا۔

اس کا جواب کسی مشرک و آفتاب پرست کے پاس کیا ہو سکتا تھا۔ نہ اس وقت کسی سے جواب بن پڑا، نہ آج بھی کسی سے ممکن ہے۔ استدلال کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ جس ہستی کے صاحب ارادۂ عظیم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ صاحب ارادۂ خفیف بھی ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن کسی "خدا" کے عاجز و لاجواب رہ جانے کا منظر اس سے بڑھ کر کیا پیش

ہوسکتا تھا۔

آیت کا توڑ قرآن کے عمومی اسلوب بیان کے مطابق اللہ کے ایک عام قانون کے بیان پر ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۝

اور اللہ راہ ہدایت نہیں دکھاتا ظالم لوگوں کو

اور ظالم لوگ کون ہوتے ہیں؟ وہی جو خلوِ ذہن کے ساتھ حقائق پر غور نہیں کرتے اور حقیقت رسی کی کوشش ہی ذہن سلیم و مستقیم کے ساتھ نہیں کرتے۔ بلکہ ضد و عناد، تقلید جامد و تعصب پر جمے رہتے ہیں۔ چنانچہ اب ظالم و فاجر "خدا" باوجود لاجواب ہونے کے ایمان نہ لایا اور اپنی بات کی پیچ پر قائم رہا۔

۳۰

ختم رکوع سے کچھ قبل ایک حکایت حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اور آئی ہے اور مشکلات القرآن کے سلسلے میں سننے کے قابل ہے، ایک دن آپ کو خیال یہ گزرا کہ حشر اجساد کیوں کر واقع ہوا، مدتوں کے مرے اور گڑے ہوئے لاشے آخر کس طرح جی اُٹھیں گے۔ اور جب خیال آیا تو اپنے رب سے بھی سوال کر بیٹھے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط (آیت ۲۶۰)

(وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار (ذرا) مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا۔

سوال اس کا ہوا کہ کیا اس کا یقین نہیں؟

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ، ارشاد ہوا کہ تمہیں اس کا یقین نہیں؟

آپ تو خیر پیغمبر تھے، یقین تو ہر عامی مومن کو ہوتا ہے، آپ کو کیسے نہ ہوتا! جواب میں

قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ...... عرض کیا کہ ضرور ہے، لیکن یہ درخواست اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے۔

یقین سے گزر کر درجۂ اطمینان اور سکون کا حاصل کر لینا چاہتا ہوں اور علم الیقین سے گزر کر مرتبۂ عین الیقین تک پہونچ جانا چاہتا ہوں، یقین کا جو مرتبہ تصدیق و ایمان کے لئے کافی ہے، وہ تو حاصل ہی ہے، اب اور اس سے بڑھ کر درجۂ اطمینان و مشاہدہ کی طلب ہے محققین عارفین نے کہا ہے کہ مقبولین کے مشاہدات سے ترقی ہی ان کے مراتب ایمان و کمالات ایقان میں ہوئی رہتی ہے، اور پھر اسی نسبت سے اضافہ ان کے تقرب، اعزاز، و قدر میں ہوتا رہتا ہے ..... اللہ کے ہونے والے خلیل میں طلب اور تڑپ اسی مرتبہ کی ہوئی تھی۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ۔

ارشاد ہوا کہ اچھا چار پرندے لو اور انھیں اپنے سے خوب ہلا لو۔

آیت میں اہم ترین لفظ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ہے، لغت میں صَادَ يَصُوْرُ کا مفہوم اپنے سے خوب ہلا لینے اور مانوس کر لینے کا ہے، اور اہل تفسیر نے یہاں اتنا مضمون محذوف مانا ہے کہ اس کے بعد انھیں ذبح کر ڈالئے اور آپس میں اس کا گوشت ملا لیجئے۔ ..... شعر و محاضرات ادب بھی ایسے محذوفات سے نامانوس نہیں، اور قرآن خود بھی ایسے محذوفات و مقدرات سے خالی نہیں۔ سورہ بقرہ کے ابتدائی ہی رکوعوں میں حضرت موسیٰ کو حکم ملا ہے کہ چٹان پر اپنا عصا مارو (فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ) اور پھر اس مضمون کو ظاہر کئے بغیر کہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور چٹان پر ضرب لگائی، یہ بیان آگیا ہے۔ بس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے (فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا) اور ایسی مثالیں اور بھی بہت سی مل جاتی ہیں۔ بلکہ لغت و تفسیر کے بعض اماموں نے تو یہ صاف لکھ دیا ہے کہ صاد یصور کے معنی خود ہی کاٹنے اور پارہ پارہ

کر ڈالنے کے ہیں۔ کسی حذف و تقدیر کے ماننے کی ضرورت ہی نہیں۔ بہرحال حذف مانا جائے تو، اور نہ مانا جائے تو اتنے جزو پر جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں مراد یہی ہے کہ چاروں پلے ہوئے پرندوں کو ذبح کر کے پارہ پارہ کر ڈالے۔ بعض مفسروں نے ان چاروں پرندوں کو متعین کر کے ان کے نام بھی لکھ دیئے ہیں۔ لیکن اول تو یہ روایت ہی کوئی مضبوط سند نہیں رکھتی۔ پھر اس تعیین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ البتہ بعض صوفیاء نے اس روایت سے خوب کام نکالا ہے۔ اور ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ان چاروں پرندوں سے اشارہ ان کی چار قوتوں کی طرف نکلتا ہے۔ جو مشاہدۂ حق اور حیاتِ روحانی سے مانع و حاجب ہوتے ہیں، اور جن کو قربان کئے بغیر انسان پاکیزگی کی منزل تک پہونچ نہیں سکتا۔ اور وہ چار نفسیاتی قوتیں یہ ہیں:۔

(۱) خود بینی یا خود نمائی یا حُبِّ جاہ
(۲) افراطِ شہوت جنسی
(۳) حرص و طمع یا حُبِّ مال
(۴) طول اَمل یا محبّت دُنیا

اچھا تو پرندوں کے اس گوشت کے مخلوطہ کو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیجئے۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً

پھر ان میں کا ایک ایک حصّہ پہاڑ پر رکھ دو۔

جُزْءً کے مسئلے کو خوب سمجھ لیجئے۔ یہ مراد نہیں کہ چاروں کے مجموعہ کا ایک ایک مسلم جزو یا ایک ایک پرندہ، بلکہ مجموعے یا مخلوطے کے ملے جلے حصّے۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ

پھر انھیں بلاؤ تو وہ تمہاری طرف دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔

جب چند روز کے کھلانے پلانے اور اپنے سے ہلا لینے سے وہ اتنے مانوس

اور مطیع اپنے مجازی مالک کے ہو جاتے ہیں کہ اس کی ایک آواز پر دوڑے ہوئے اس کے پاس چلے آتے ہیں، تو میری ہی پیدا کی ہوئی روحیں، میرے بُلاوے پر کیسی بے چون وچرا اور کیسی بے خطا میرے پاس بھاگتی ہوئی نہ آجائیں گی۔ اور اس کے ایک مشاہدے نے تمہارے دل کے اندر یہ حقیقت اُتار دی ہوگی؟

وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ۝ (آیت ۲۶۰)

اور اسے جانے رہو کہ اللہ زبردست ہے اور حکمت والا۔

آیت کا خاتمہ حسب معمول اس انمول پند پر ہوا ہے، کہ اسے خوب جانے بوجھے رہو کہ اللہ تو ہر ہر چیز پر یکساں غالب و قادر ہے دشوار اور محال اس کے نزدیک کیا ہے۔ اشد و اسہل اس کے لئے سب برابر۔ یہ تفریقیں تو انسان کے اپنے معیار سے ہیں۔ اور باوجود اس عموم قدرت و اختیار مطلق کے وہ کرتا صرف وہی ہے۔ جو عین اس کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوتا ہے۔

* * *

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیسرا خطبہ

سورۂ آلِ عمران میں سیدہ حضرت مریمؑ کا قصہ ذرا تفصیل سے آتا ہے، اور توجہ سے سننے والا ہے۔

اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ
مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ
السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ۝ (آیت ۳۵)

وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے منذر مانی ہے اس (بچہ) کے لئے جو میرے پیٹ میں ہے آزاد رکھا جائے گا، سو تو یہ مجھ سے قبول کر تو خوب سُننے والا خوب جاننے والا ہے۔

عمران کے نام کی تاریخی شخصیتیں دو گزری ہیں۔ ایک حضرت موسیٰؑ کے والد ماجد عمران بن صہر، اور دوسرے ان سے صدیوں بعد، حضرت مریم کے والد ماجد اور حضرت عیسیٰ کے نانا۔ عمران بن ماثان/ سیاق میں یہی مراد ہیں۔ امرأۃ عمران یعنی انکی بیوی، ان کا نام مسیحی نوشتوں میں حنّہ (Hannah) آیا ہے اور ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ شام وغیرہ میں مسیحی کلیسا، کلیسائے حنّہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور ان کی قبر شہر دمشق میں ہے۔

مُحَرَّرًا یعنی ہر قسم کے دنیوی علائق سے آزاد رہے گا۔ اور تیری ہی خدمت اور چاکری کے لیئے وقف رہے گا۔

جب سے آپ حاملہ تھیں اور اُمید فرزند نرینہ کی کر رہی تھیں تو آپ نے اسوقت یہ مناجات حق تعالیٰ سے کی تھی۔ ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کی خدمت کے لیئے اولاد ذکور کو نذر کرنے کا دستور اس وقت تھا۔ اور والدۂ مریم نے اس دستور کے مطابق یہ منت مان لی تھی۔ اس دعا سے متعلق اور بھی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں موجود تھیں۔ لیکن جب آبائے کلیسا نے کاٹ چھانٹ کر کے "مستند" انجیلیں مرتب کرنا شروع کیں تو انھوں نے ایسے بہت سے بیانات کو حذف کر کے اپنی مستند کتابوں سے خارج کر دیا۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مسیحی فاضل کہہ رہے ہیں۔ مثلاً کیتھولک ڈکشنری میں ص ۴۸ پر اور ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائیبل جلد ۲ کے ص ۲۰۸ پر۔

دُعا کے آخر میں ہے کہ تو تو خوب سُننے والا میری دعاؤں کا اور جاننے والا میری آرزوؤں کا ہے۔

لیکن ولادت جب ہوئی تو خلاف توقع بجائے لڑکے کے لڑکی کی، تو اب وہ بیچاری چکر میں پڑ گئیں کہ اب کیا صورت نذر پوری کرنے اور منت اُتارنے کی ہو سکتی ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ط

پھر جب وہ لڑکی جنی تو یہ بولیں کہ اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی۔ تو اے اللہ میرے۔ اب کیا کروں اور اپنی نذر کیسے پوری کروں۔

اب اللہ میاں کے دوران کلام میں بی بی حنہ سے فرماتے ہیں:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ج

اور اللہ تو ان سے بڑھ کر جانتا تھا کہ انھوں نے کیا جنا ہے، اور لڑکا

لڑکی کے برابر نہیں ہوسکتا تھا۔

یعنی اللہ نے تو خوب سمجھنے کے بعد ہی لڑکی عطا کی تھی۔ اور ماں غریب کو کیا خبر ہوسکتی تھی کہ یہ لڑکی کس عظمت و منزلت کی ہوگی۔ اور پھر اس کے بطن سے پیدائش کس فرزند جلیل کی ہوگی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اب اسی دعا کا بقیہ سُنیے :۔

وَاِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ (آیت ٣٦)

خیر میں نے تو اس کا نام مریم رکھ لیا ہے، اور میں اس کو اور اسکی اولاد کو تیری پناہ میں شیطان رجیم سے دے رہی ہوں۔

مریم نام یہود میں چلا ہوا تھا۔ اور اس کے لفظی معنی سُریانی زبان میں بلند کے ہیں۔ (اقرب الموارد)

الفاظ دعا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ والیوں کو کتنی فکر اپنی اولاد کے دینی و اخلاقی تحفّظ کی ہوتی ہے۔ اب قصہ اس کے بعد کا ملاحظہ ہو۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۔

پھر ان کے پروردگار نے ان کو بوجہ احسن قبول کرلیا اور اس کو اچھا نشو و نما دیا اور اس کا سرپرست زکریا کو بنا دیا۔

یعنی اللہ نے والدۂ مریم کی نذر کو لڑکی کی شکل میں قبول کرلیا۔ اور یہ خدمت ہیکل سلیمانی کی ساری تاریخ میں ایک نئی بات ہوئی۔ مسیحی نوشتوں کے بموجب حضرت مریم تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے چن لی گئیں اور بعد کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچّی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

اور آپ کا نشو و نما کیا جسمانی اور کیا اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ بالغ اور سیانی ہوگئیں۔

کَفَّلَهَا زَکَرِیَّا سے اشارہ اس طرف بھی ہوگیا کہ یہ سارے انتظامات خدائی تھے، زکریا کی حیثیت صرف واسطہ کی تھی۔ حضرت زکریا اسلامی عقیدہ میں اللہ کے پیمبر تھے، مسیحی نوشتوں میں ذکر والدۂ مریم کا تو پھر آیا ہے مگر حضرت زکریا کے ذکر سے مسیحی صحیفے تقریباً خاموش ہی ہیں۔ چاروں مستند انجیلوں میں نام صرف ایک بار آیا ہے۔ انجیل لوقا میں، وہ بھی پیمبر کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف ایک بزرگ اور راست باز کاہن کی حیثیت سے۔

> "یہودیہ کے بادشاہ ہیروڈس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام ایک کاہن کا تھا۔"
> (لوقا ۔ ۱ : ۵)

آپ رشتے میں حضرت مریم کی والدہ کے بہنوئی تھے۔ یعنی ان کی والدہ کی بہن کے شوہر۔ حضرت مریم کے والد جناب عمران کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ اور ان کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں یا مجاوروں کی سرداری انھیں حضرت زکریا کے حصہ میں آئی تھی۔ حضرت مریم کی تربیت کا واسطہ بھی اللہ نے آپ ہی کو بنایا۔ حضرت یحییٰ آپ ہی کے فرزند تھے۔ جو حضرت عیسیٰ کے ہم سن تھے، آپ کی تاریخ وفات کہیں نظر سے نہیں گزری۔ آپ کے زمانہ کا بس اندازہ ہی ان حسابوں سے کیا جاسکتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ ہی کی طرح حضرت مریمؑ اور حضرت زکریا بھی ایسی دو شخصیتیں ہیں جن کی عظمت و شرف قائم رکھنے کا اہتمام قرآن ہی نے اسرائیلی تاریخ اور مسیحی نوشتوں اور عقیدوں سے کہیں زیادہ کیا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ
عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ۔

جب جب زکریا ان کے پاس حجرے میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے پینے کی پاتے۔

محراب عربی میں، اردو کی محراب سے الگ، حجرے کو کہتے ہیں۔ جہاں کوئی سب سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھے اور ہیکل سلیمانی کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل کے ادھر ادھر زاویے اور حجرے بنے ہوئے تھے۔ انھیں میں سے ایک حجرہ حضرت بی بی مریم کا تھا۔ حضرت زکریا یوں بھی سردار خدام تھے۔ اور ہر خادم کی نگرانی آپ کے فرائض میں شامل، اور آپ پھر اس نو عمر خادمہ کے تو عزیز قریب اور بزرگ[۴] سرپرست بھی تھے۔ حجرۂ مریم میں قدرتاً آپ کی آمد و رفت رہا کرتی۔ كُلَّمَا قرآن مجید کے اس ذرا سے لفظ نے اس سارے مفہوم یعنی آپ کی کثرت آمد و رفت، اور وقت بے وقت آمد، سب کی طرف اشارہ کر دیا۔ رِزْقًا سے مراد کھانے پینے کا سامان ہے مثلاً تر و تازہ پھل اور میوے۔ اور امام رازی نے لکھا ہے کہ لفظ کی تنوین سے تعظیم نکلتی ہے، یعنی وہ رزق جو کوئی عجیب و غریب پہلو رکھتا تھا۔ بعض قدیم جدت پسندوں نے رزق کو استعارہ قرار دے کر اس سے مراد "فیض" لی ہے۔ اس پر ابوحیان غرناطی صاحب البحر المحیط نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر کے حدود سے تجاوز کر کے باطنیہ کی زبان اختیار کر لینا ہے۔

بہ طور جملہ معترضہ یہ بھی سن رکھئے کہ بی بی مریم چونکہ نبی نہ تھیں، محض ولی تھیں، جس سے امامیہ کو بھی اہل سنت کے ساتھ اتفاق ہے۔ اس لئے اس آیت سے محققین نے اثبات کرامت و خرق عادت پر استناد کیا ہے۔ حضرت زکریا کو اس پر حیرت ہونا بالکل قدرتی تھی اور پیمبر تک کے لئے ضروری نہیں کہ ہر معاملہ میں اپنی نظر کو اسباب ظاہر کے باہر دوڑائے۔

آپ حیرت سے سوال کر بیٹھے:۔

قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا ؕ

پوچھ بیٹھے کہ اے مریم یہ (سب) تجھے کہاں سے مل جاتا ہے"؟
لاتا تو میں ہی لاتا۔ میرے سوا کون یہ چیزیں پہنچا دیتا ہے؟

قَالَتْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (آیت ۳۷)

بولیں کہ یہ اللہ کی طرف سے (آجاتے ہیں) اور بیشک اللہ جس کو چاہے، اسے رزق بے حساب دے دیتا ہے۔

عارفہ کی نظر اسباب پر نہیں مسبب الاسباب پر تھی، اس نے وہی جواب میں کہہ دیا اور اس پر اضافہ بھی اس نکتۂ عارفانہ کا کر دیا کہ اللہ کی مشیت کسی واسطہ اور کسی حق و استحقاق کے ساتھ مقید نہیں۔ وہ جب کسی کو دینے پر آئے تو بلا واسطہ اسباب بھی دے سکتا ہے اور بلا استحقاق بھی۔

ضمناً اس میں رد نکل آیا ان مشرک قوموں کا جنھوں نے خوش حالی اور تنگ حالی کو لازمی نتیجہ قرار دیا ہے پچھلے جنم کے اعمال کا۔ اسلام کا خدا جس طرح اپنی مشیت تکوینی کے ہر جزء میں آزاد ہے۔ اسی طرح تقسیم رزق میں بھی۔

آگے سنیئے :۔

ھُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّہٗ ج

بس وہیں زکریا اپنے رب سے دعا کرنے لگے۔

قدرت و رحمت الٰہی کے تازہ کرشموں سے حضرت زکریا کا تأثر قدرتی تھا۔

ھُنَا ظرف مکان، ظرف زمان کے معنی میں آیا ہے۔ اس لئے دوسرا ترجمہ بجائے "وہیں" کے "معًا" بھی ہو سکتا ہے۔ غرض جوں ہی آپ پر منکشف ہوا کہ یہ مقام قبولیت کا، اور خرق عادت کے صدور کا ہے، آپ خود بھی مصروف دعا ہو گئے۔

قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ
اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (آیت ٣٨)

عرض کی کہ اے میرے پروردگار اپنے پاس سے ایک پاکیزہ اولاد دے بے شک تو دعا کا بڑا سننے والا ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً یعنی اولاد پاکیزہ جو میرے سلسلہ روحانی کو آگے چلا سکے۔ مجھے بھی اولاد صالح اسی طرح عنایت ہو جس طرح والدہ مریم کو مریم عنایت ہو چکی ہیں، حضرت زکریا کبرسنی کو پہونچ چکے تھے، اور بیوی صاحبہ بھی عقیم یا بانجھ سمجھ لی گئی تھیں۔ ایک خارق عادت واقعہ کو دیکھ، آپ کا ذہن قدرتاً اس طرف منتقل ہوا کہ جو خدا اس پر قادر ہے، کہ بلا اسباب ظاہری تر و تازہ پھل پھلاری پہنچا دے، وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ اس سن میں مجھے نعمت اولاد سے سرفراز کر دے!

مِنْ لَّدُنْكَ یہ جزو اسے صاف کر رہا ہے کہ دعا مانگنے والے کی نظر اس دنیا میں بھی اسباب سے بڑھ کر خالق اسباب پر ہے۔

قدرتاً اولاد کی خواہش امر طبعی ہے اور زہد کیا معنی کمال زہد کے بھی منافی نہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کی دعائیں پیمبروں کی زبان سے ادا کرا کے یہ بتا دیا کہ جن مذہبوں نے بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہیں طلب اولاد کی دعا تو سنت انبیا و صدیقین ہے، اور صحیح بخاری میں ایک مستقل باب طلب اولاد کے فضائل میں ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً کے اضافہ نے صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر آخرت پر بہرحال رہتی ہے۔ کوئی مضائقہ اولاد کی مطلق خواہش میں بھی نہ تھا، لیکن حضرت زکریا اپنے لئے محض اولاد ہی نہیں چاہتے، اولاد طیب و پاکیزہ چاہتے ہیں جو ان کے بعد دین حق کی تبلیغ کا مشن جاری رکھے، اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی و روحانی

فضائل بہرحال مقدم رہتے ہیں۔ انجیل میں بجائے اس دلآویز، مؤثر، روح پرور تفصیل کے قناعت صرف اس خشک مختصر واقعاتی بیان پر کی گئی ہے۔

> ”ذَکَرِیَّا نام کا ایک کاہن تھا، اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور ان کے اولاد نہ تھی، اس لئے کہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے“ (لوقا۔ ۱: ۵۔ ۷)

اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الدُّعَآءِ تو دعاؤں کا بڑا سننے والا اور بڑا قبول کرنے والا ہے۔ حق تعالیٰ کی اس صفت کو بار بار بیان میں لانا ان مادی اور نیچری عقیدہ والوں کے رد میں ہے، جو واقعات کو تمام تر اسباب ظاہری و مادی ہی کا نتیجہ سمجھتے اور ارادۂ حق تعالیٰ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ دعا معًا قبول ہو گئی اور حالت نماز ہی میں فرزند کی بشارت مل گئی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی (آیت ۳۹)

انھیں فرشتوں نے آواز دی اور وہ ابھی نماز حجرہ میں کھڑے ہوئے پڑھ رہے تھے کہ اللہ تم کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔

اَلْمَلٰٓئِکَةُ کا صیغۂ جمع کھٹک نہ پیدا کرے۔ یہ لازمی نہیں کہ آواز دینے والے فرشتے متعدد ہوں۔ عربی میں صیغۂ جمع اسم جنس کا بھی کام دیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ملائکہ سے مراد صرف جنس ملائک ہی ہو، اور عربی میں یہ محاورہ عام ہے۔ فَلَان یرکب الخیل (فلاں شخص گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے) حالانکہ وہاں مراد گھوڑے کی جنس ہوتی ہے نہ کہ ان کا تعدد۔

یَحْیٰی۔ فرزند کی صرف بشارت ہی نہیں ملی، بلکہ نام بھی عطا ہو گیا۔ انجیل میں تلفظ یوحنّا آیا ہے۔ اس خاص موقع پر عبارت یہ ہے:۔

”فرشتے نے اس سے کہا اے زکریا خوف نہ کر، کیونکہ تیری دعا سُنی گئی۔ اور تیری بیوی الیشبع تیرے لئے بیٹا جنے گی، اس کا نام یوحنا رکھنا، اور تجھے خوشی و خرمی ہو گی“ (لوقا۔ ۱:۱۴)

یہ حضرت عیسٰی کے خالہ زاد بھائی تھے اور حسب روایت انجیل، ان سے سن میں صرف چھ مہینے بڑے، سنہ ۳۰ء میں حاکم شام و فلسطین ہیرود کے حکم سے شہید کر دئے گئے۔ یحیٰی کا صرف نام ہی نہیں عنایت ہوا۔ بلکہ کچھ اوصاف کی بھی پیش خبری دی گئی۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آیت ۳۹)

کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا اور بڑے نفس کے ضبط کرنے والے اور نبی صالحین میں سے۔

ان الفاظ کو خوب سمجھ لیجیئے۔ جس طرح روح القدس ایک لقب حضرت جبریل کا ہے كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ سے مراد حضرت مسیح ہیں۔ ابن عباس صحابی اور متعدد جلیل القدر تابعین سے یہی منقول ہے۔ یعنی تصدیق حضرت عیسٰی کی کرنے والے۔ اور مسیحی عقیدہ میں حضرت یحیٰی کی اصل حیثیت مسیح کے نقیب ہی کی ہے۔

سَيِّدًا یعنی دین کے باب میں مقتدا اور پیشوا۔ عیسائی تو خیر آپ کی بزرگی کے قائل ہی ہیں۔ یہودی بھی باوجود آپ سے بدعقیدگی اور دشمنی کے، آپ کی مرجعیت اور مقبولیت کے منکر نہیں۔

حَصُوْرًا یعنی اسے اپنے شہوات اور جذبات پر قابو حاصل ہو گا اور وہ نہایت درجہ محتاط و متقی ہو گا۔ انجیل میں آپ کے زہد و عفاف کا ذکر مختلف موقعوں پر صراحت و تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً:

”خداوند کے حضور میں بزرگ ہو گا، ہرگز نہ وہ مے اور نہ کوئی اور شراب

پیئے گا۔ اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے وہ روح القدس سے بھر جائے گا" (لوقا۔ ا: ۱۶)

اور اسی انجیل لوقا میں آگے چل کر ہے :۔

> " اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیئے ایک مستعد قوم تیار کرے"۔ (لوقا۔ ا: ۱۷، ۱۸)

اور پر اسی لوقا میں ہے:

> " اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا، اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا"۔ (لوقا۔ ا: ۸۰)

نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ ذرا سا فقرہ دو چیزوں کا اثبات کرتا ہے: ایک آپ کی نبوت کا، یہ رّد ہے یہود کا جو آپ کو بجائے نبی کے ایک بنا ہوا انقلابی سمجھتے تھے۔ دوسرا آپ کی صالحیت کا اثبات، نصرانیوں کے مقابلہ میں ہے۔ صالحیت تو نبوت سے ہلکی اور پست چیز ہے۔ اور جب کوئی نبی ہے تو آپ کہیں گے کہ ظاہر ہے کہ وہ صالح تو ہوگا ہی۔ لیکن یہ ظاہر کہاں ہے؟ یہ تو صرف اسلام کی تعلیم ہے، اسلام ہی نے آکر یہ سبق سکھایا، ورنہ اہل کتاب کے ہاں تو تقویٰ لازمۂ نبوت تھا ہی نہیں۔ اور نبی کوئی غیر صالح بھی ہو سکتا تھا۔

حضرت زکریا کو بشارت تو بیٹے کی مل گئی اور اپنی دعا کی بھرپور مقبولیت پر آپ کو جیسی مسرت ہوئی ہوگی، ظاہر ہے، پھر بھی آپ بشر ہی تھے اور بشریت کے تقاضے سے حیرت میں بھی تھے کہ قدرت کے معمولات عام سے اس قدر ہٹ کر کوئی واقعہ واقع ہوگا کیونکر۔ یہ شبہ بھی بے تکلف جناب باری میں پیش کر دیا۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ
وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ

عرض کی کہ اے میرے پروردگار میرے بیٹے کس طرح ہو گا۔ اس حال میں کہ مجھے کبر سنی نے آ لیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔

آیت یہ تعلیم بھی دے رہی ہے کہ خلاف اسباب مادّی کسی شے کی خبر وقوع پر حیرت جس طرح ہر بشر کے لئے ایک امر طبعی ہے، خود پیمبر بھی اُمور طبعی میں بالکل بشر ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے بھی بالکل جائز ہے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ٥

اللہ اسی طرح کر دیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے۔

رفع استبعاد کے لئے بس استحضار قدرت الٰہی کا یہ مراقبہ بالکل کافی ہے اور پیمبر کو اس استحضار کے لئے ایک اشارہ کافی ہو گیا۔ اب عرض کی کہ اس کے لئے کوئی خاص نشان بھی ارشاد ہو جائے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ٥ (آیت ۴۱)

بولے اے پروردگار میرے لئے کوئی نشان مقرر کر دے۔

یعنی کوئی ایسی علامت اعجازی رنگ میں ظاہر ہو جائے جس سے متعین طور پر مجھے یقین ہو جائے کہ حمل قرار پا گیا اور زمانہ ولادت اب قریب ہے۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ٥ (آیت ۴۱)

ارشاد ہوا کہ نشانی تمہارے لئے یہ ہے کہ تم بات چیت تو نہ کر سکو گے لوگوں سے تین دن تک بجز اشارات کے، باقی اپنے پروردگار کو بہ کثرت یاد کرتے رہو اور اس کی تسبیح بھی دن میں بھی اور شام میں بھی۔

یعنی وہ نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تم لوگوں سے بات چیت تو نہ کر سکو گے باقی اپنے پروردگا

کی یاد خوب کرتے رہو۔ اور اسکی تسبیح بھی صبح و شام کرتے رہو۔ اور محاورۂ زبان میں اس سے انھیں دو دو وقتوں کی تعیین اور حصر مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ دوام ذکر و تسبیح ہی مراد ہوتا ہے۔ قرآن مجید جو تمام آسمانی صحیفوں پر مہیمن یعنی نگراں و نگہبان ہے۔ اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ ان غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا جائے۔ اس نے اپنا فرض یہاں بھی انجام دیا۔ ورنہ انجیل کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی لغزش و معصیت حضرت زکریا سے سرزد ہو گئی تھی۔ اور اس کی سزا یہ ملی تھی کہ چند روز کے لئے آپ کی قوتِ گویائی سلب کر لی گئی تھی۔ چنانچہ انجیل کی عبارت اس موقع پر یہ ہے:۔

"اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ بس انھوں نے معلوم کر لیا کہ اس نے مقدس رویا دیکھا ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا بنا رہا (لوقا۔ ۱: ۲۰)

غرض یہ کہ یہ تین دن کی خاموشی بہ طور سزا یا عذاب کے تھی۔ ہرگز صحیح نہیں۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ بلکہ گفتگو اس میں البتہ چل سکتی ہے کہ یہ سہ روزہ خاموشی آیا تمامتر اضطراری تھی یا اختیاری۔ یہ جمہور مفسرین کے اتباع میں ہے جو کہ آیت کے ترجمہ میں ابھی یہ عرض کیا گیا ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کر سکو گے، ورنہ الفاظ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ کا صاف سیدھا اور بے تکلف ترجمہ تو یہ ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کرو گے (نہ کر سکو گے) مفسرین میں خال خال کوئی اس طرف بھی گیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں اس کو ابو مسلم معتزلی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور خود اس کی کوئی تردید نہیں کی ہے۔

گویا حکم الٰہی یہ مل رہا ہے کہ زکریا تم تین دن تک گفتگو میں زبان بند رکھنا۔ ہاں ذکر الٰہی و تسبیح کثرت سے کئے جانا الا تکلم الناس میں الناس گویا فقرے کی جان ہے۔ یعنی خلق پر گفتگو کی قدرت نہ رہے۔ باقی ذکر الٰہی کے لئے زبان بدستور چلتی رہے گی۔

٣٢

حضرت زکریا کا تذکرہ درمیان میں آجانے کے بعد اب پھر ذکر مریم شروع ہوتا ہے

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (آیت ٤٢)

اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک کیا ہے اور آپ کو دنیا جہاں کے مقابل میں برگزیدہ کیا ہے۔

مَلٰٓئِكَةُ کے صیغہ جمع سے، جیسا ابھی چند منٹ عرض کیا جا چکا ہے، یہ لازم نہیں آتا کہ کہنے والے کئی فرشتے ہوں، صیغہ جمع اسم جنس کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے۔ رہی فرشتوں کی ہم کلامی کسی غیر نبی سے، تو وہ تو ثابت اس آیت سے ہو جاتی ہے البتہ محققین نے لکھا ہے کہ فرشتے کا اللہ کی طرف سے پیام تبلیغ صرف نبی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ، اس اصطفا کا تعلق مریم کے بچپن سے ہے۔ یعنی اللہ نے برگزیدگی تو آپ کو شروع ہی سے دے رکھی ہے۔ آپ وجود میں آئیں تو اپنی والدہ کی مقبول دعاؤں کے اثر سے۔ پھر آپ سے کام ہیکل کی خدمت کا لیا گیا۔ جو اب تک مخصوص رہا تھا مردوں اور لڑکوں کے ساتھ، اور آپ کو آپ کے حجرے میں غذائیں جس اعجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اس نے زکریا پیغمبر تک کو متحیر کر دیا۔ یہ سب مثالیں آپ کی مقبولیت ہی کی تو ہیں۔

وَطَهَّرَكِ، یعنی اللہ نے آپ کو نبی نہ ہونے کے باوجود گناہوں کی آلائش سے پاک کر دیا ہے اور آپ کو اخلاقی پاکیزگی کا ایک نمونہ بنا دیا ہے ـــــ یہ سب رد میں ہے یہود کے جو گندے الزامات آپ پر لگانے کے مرتکب ہوئے تھے

وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اس دوسرے اصطفاء کا تعلق

آپ کے بلوغ کے بعد سے ہے۔ اور پیدائش کے بعد یہ دوسری برگزیدگی خاص خاص حیثیتوں سے ہے۔

اور ان آیتوں کے بعد پھر وہی مضمون شروع ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ (آیت ۴۵)

اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ آپ کو خوشخبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ ان کا نام و لقب مسیح ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں مقربوں میں سے۔

مسیح پیمبر کے ذکر میں یہود و عیسائیوں دونوں کے رد کس خوبی کے ساتھ ساتھ نکلتے آتے ہیں۔ ابن مریم کہہ کر قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کردی کہ حضرت عیسیٰ خود تو بشر تھے ہی۔ فرزند بھی کسی دیوی دیوتا، کسی مافوق البشر کے نہ تھے، محض ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اس ابن مریم سے اشارہ اس طرف ہوگیا کہ دنیا کے عام دستور کے خلاف حضرت عیسیٰ کا انتساب بجائے باپ کے ماں کی جانب ہوگیا۔ اور اس سے کچھ نہ کچھ روشنی آپ کی خرق عادت ولادت پر بھی پڑگئی۔

وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ، یہ بات یہود کے رد میں ہے کہ تم نے جس کے حق میں ہر طرح کی توہین روا رکھی ہے وہ کتنی عزت و اکرام والا ہے۔ دنیا کا اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کے غالیانہ عقیدے کو چھوڑ کر خود مسلمان جو دنیا میں ۴۰، ۵۰ کروڑ کی تعداد میں ہیں، ان کو اپنا ایک سردار اور اللہ کا پیمبر برحق مان رہے ہیں اور ان کا نام بغیر علیہ السلام کے نہیں لیتے اور خود یہ بھی کچھ کم نہیں کہ اب یہود تک کے لہجہ میں نرمی آگئی ہے۔ اور صدیوں کی عداوت و عناد کے بعد اب کسی درجہ میں ان کے اجلال و اکرام کا اعتراف

انھیں بھی کرنا پڑگیا ہے۔

مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۔ ایک لفظ میں یہود اور نصرانیوں دونوں کا رد نکل آیا پہلا رد نصرانیت کا یعنی وہ اللہ کے مقرب اور برگزیدہ بندے ہیں نہ کہ خود خدا۔ دوسرا رد یہود کا کہ وہ کوئی شعبدہ باز یا ساحر نہ تھے۔ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ کی ترکیب یہ ظاہر کیے دیتی ہے کہ وہ مقبولیت میں منفرد نہیں، بلکہ ایک جماعت ان کے شریک ہے۔

وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (آیت ۴۶)

اور گفتگو کریں گے لوگوں سے گہوارے میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے۔ ۱

فِی الْمَھْدِ مراد کم عمری کا سن ہے، مفسرین نے آپ کے بچپن کا زمانہ مراد لیا ہے۔ بچپن ہی سے آپ کی باتیں قصہ کہانی کی نہیں بلکہ حکمت دینی و روحانی کی ہوتی تھیں/ انجیل لوقا کے باب ۴ میں متعدد قول حکمت و دانائی کے آپ کی زبان سے نکلے ہوئے جمع کر دیے ہیں۔ جو آپ سے بارہ سال کی عمر میں صادر ہوئے تھے۔ اور کَھْلًا سے مراد ہے پختہ عمری۔ یعنی نوجوانی کے بعد اور بڑھاپے سے قبل کا سن۔ مثلاً تیس سال سے لے کر پچاس سال کی عمر۔ مقصد یہ ہے کہ آپ میں جوش تبلیغ شروع سے آخر تک برابر بھرا رہا۔ اور عمر کے گزرنے کے ذکر میں اشارہ آپ کی الوہیت کی رد کا بھی نکل آیا۔ یعنی آپ کا جسمانی نشوونما اسی طرح ہوتا رہا۔ جیسے ہر انسان کا ہوتا ہے۔

وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ جب آپ نبی تھے تو اسلامی نقطۂ نظر سے موٹی بات ہے کہ صالح کیسے نہ ہوتے۔ لیکن قرآن کا مقصود یہاں بھی اپنے معمول کے مطابق یہودیت و نصرانیت کا دو طرفہ رد رکھا ہے۔ یہود کو اس نے یہ بتایا کہ آپ نعوذ باللہ شعبدہ باز یا ساحر نہ تھے، جیسا کہ انھوں نے افترا کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف نصرانیوں کو یہ بتلایا ہے کہ وہ معبود یا نیم معبود نہ تھے۔

آپ بہرحال دوسرے انبیاء صالحین کی طرح بشر تھے نہ کہ فوق البشر یا دیوتا۔

جب فرشتہ کی یہ صدائے غیب حضرت مریم کے کان میں پڑی تو آپ نے حیرت کے ساتھ اپنے پروردگار سے مناجات کی :۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ

بولیں اے میرے پروردگار میرے اولاد کس طرح ہوگی اور اں حالیکہ مجھے کسی مرد نے (بغرض مواصلت) ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔

حسب روایت انجیل حضرت مریم کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی اور قبل رخصتی خلوت یہود کے قانون مروج میں بالکل ممنوع تھی ۔

قَالَتْ رَبِّ "رَبّ" بہ ظاہر بالکل معمولی اور ناقابل التفات سا لفظ ہے۔ لیکن انجیل میں یہی مقام کھول کر دیکھ لیجیے، لکھا ہے کہ :

" ہم نے فرشتہ سے کہا " (لوقا۔ ۱ : ۳۴) اس ذرا سے فرق سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن نے آپ کا مرتبۂ معرفتِ توحید کس درجہ اونچا کردیا ہے !

اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ ۔ سوال ظاہر ہے کہ واقعہ کی حیرت انگیزی اور غرابت کی بنا پر تھا نہ کہ کسی شک و انکار کی بنا پر۔

فرشتہ سے یہ دو بہ دو گفتگو سن لینے کے بعد انکار کا کوئی محل ہی باقی نہیں رہا تھا۔ استبعاد البتہ باقی تھا۔ جو لازمۂ بشریت تھا۔ اور حضرت زکریا کی جو حکایت بشارت فرزند کے وقت کی بیان ہوچکی۔ اس سے یہ حکایت کتنی ملتی ہوئی ہے

جواب بھی اسی رنگ کا ارشاد ہوا۔

قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○ (آیت ۴۷)

فرمایا ایسے ہی اللہ پیدا کردیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے، وہ جب کسی بات کو

پورا کرنا چاہتا ہے، تو بس اس سے کہتا ہے ہو جاؤ۔ بس اور وہ ہو جاتی ہے۔

رفع استبعاد کے لئے حضرت مریم کو یاد دلایا گیا کہ فاعل حقیقی تو ہماری مشیت اور ہمارا ارادہ ہے، نہ کہ اسبابِ طبعی و مادی و عادی، کہ وہ تو سب کے سب بس درجۂ واسطہ و وسیلہ میں ہیں۔ تو نظر صرف ہم ہی پر رکھو۔

یاد کر لیجئے کہ ایسے ہی موقع پر حضرت زکریا سے جو فرمایا گیا تھا۔ اس کے الفاظ تھے۔ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ، وہاں يَفْعَلُ اور یہاں يَخْلُقُ کا استعمال کیا محض اتفاقی ہے؟ جواب میں دو باریک بین مفسروں، ایک ابو حیان غرناطی صاحب البحر المحیط اور دوسرے صاحب روح المعانی آلوسی بغدادی نے لکھا ہے کہ حضرت زکریا کی اولاد کے معاملہ میں معاملہ کچھ ایسا غیر معمولی نہیں ہو رہا تھا۔ ولادت عام سنت الٰہی کے مطابق، یعنی مرد و زن کے اتصال سے ہو رہی تھی۔ دونوں صرف سن سے اُترے ہوئے تھے۔ اس ندرت کے اظہار کے لئے يَفْعَلُ بالکل کافی ہو گیا۔ یہاں حضرت مریم کے معاملہ میں عام و جاری سنتِ الٰہی سے ہٹ کر بغیر مرد و عورت کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق کرانا تھا۔ اس لئے یہاں اس کی صفت تخلیق لائی گئی، جو اللہ کی قوت ایجاد و ابداع پر صاف دلالت کر رہی ہے۔

اور انھیں مطالب کو شیخ رشید رضا مصری صاحب المنار نے اور زیادہ بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اِذَا قَضٰىٓ اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ ٥ "جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو بس اِدھر اس سے کہا کہ ہو جا اور اُدھر وہ ہو گئی"۔ اللہ کیا کسی سامان کا محتاج ہے۔ اس قسم کی آیتیں برابر ان فلسفیوں اور باطل مذہبوں کے رد میں ہیں۔ جو قدیم کو حادث پر قیاس کر کے قدیم کو بھی سلسلۂ اسباب کا پابند سمجھے ہوئے ہیں۔

لکہ۔ ہندوستان کے ایک بے مغز غیر مسلم مذہبی لیڈر نے ایک سوال یہ اُٹھایا تھا

کہ جب کوئی شے موجود ہی نہیں ہے تو یہ کہا کس سے جاتا ہے؟ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی میں تو موجود ہوتی ہی ہے۔ بس اسی کو حکم ملتا ہے کہ عالم عنصری میں بھی موجود ہو جائے اور قول کُنۡ سے بھی مراد اس دو حرفی لفظ کا تلفظ نہیں، اس لئے کہ یہ حروف تو خود ہی حادث ہیں۔ مراد اللہ تعالیٰ کا قول اس کیفیت کے ساتھ ہے، جو اس کی شان کمال کے لائق ہے اور اور جس طرح اس کی دوسری تمام صفات کی تفصیلات ادراک بشری کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس کے اس قول کی بھی کیفیت تفصیل کے ساتھ نہیں سمجھائی جا سکتی۔ مراد صرف یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی اور اس کی تعمیل کے درمیان کوئی بھی شے حائل یا حاجب نہیں بن سکتی۔

لمبا چوڑا جملہ معترضہ ختم ہوا۔ اب پھر اصل موضوع پر آئیے اور وہ مولود جو جناب مریم کو عنایت ہوگا، وہ ہوگا کس صفت کا؟

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (آیت ۴۸)

اللہ اسے سکھا دے گا کتاب اور حکمت اور تورات و انجیل۔

ان کلمات سے حضرت مسیح کے جس مقام عظمت کا اظہار مقصود ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود حضرت مریم کی بھی تشفیٔ خاطر کا کتنا سامان ہوا جا رہا ہے! ارشاد گویا یہ ہوا جا رہا ہے کہ تم غمگین و پریشان نہ ہو، بے شوہری اولاد کی بنا پر خلق تمہیں جتنا بھی مطعون و رسوا کرے گی اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمہیں کس پایہ کی عطا ہو رہی ہے؟

الْكِتٰبَ، بہ طور اسم جنس تمام آسمانی کتابوں کے لئے آیا ہے اور الْحِكْمَةَ سے مراد تمام دینی علوم و معارف ہیں جو پیمبر صاحب کتاب کو علاوہ اس کی مخصوص کتاب کے اس کی شرح و تتمیم کے طور پر عطا ہوتے ہیں۔ اور ابھی آگے سنیئے:

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ اور وہ پیمبر ہوگا بنی اسرائیل کے لئے۔

آپ کا صحیح اور اصلی مرتبہ پیمبر کا ہوگا نہ کہ آپ نعوذ باللہ ساحر و شعبدہ باز ہوں گے۔ جیسا کہ یہود نے گڑھ لیا ہے۔ اور نہ خدا یا فرزند خدا، جیسا کہ نصرانیوں نے فرض کر لیا اور

ہر پیمبر جس طرح اس وقت تک اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوتا رہا تھا، آپ بھی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوں گے ـــــ اور آگے آپ کی زندگی کا مشن اور آپ کے فضائل و کمالات آپ ہی کی زبان سے بیان کرا دیے ہیں۔

أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ
الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ
اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ
اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (آیت ۴۹)

اور وہ کہے گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، تمہارے لئے مٹی سے پرند کی مانند صورت بنا دیتا ہوں۔ تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ تمہیں بتلا دیتا ہوں بے شک اس (سب) میں تمہارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

لفظ آیَۃً (نشانی) یہاں معجزہ کے مفہوم میں ہے۔ معجزہ ہر اُس واقعہ کا نام ہے جو عام اور متعارف سلسلۂ اسباب سے الگ کسی پیمبر کی تائید یا شہادت میں واقع ہوتا ہے۔ فاعل اس کا تمام تر حق تعالے ہی ہوتا ہے، جو ہر واقعہ موافق و معمول حسب دستور عام ہی کا ہوتا ہے۔

مِنْ رَّبِّكُمْ (تمہارے پروردگار کی طرف سے) یہ اضافہ اس کی تاکید اور اس حقیقت پر زور دینے کے لیئے ہے کہ معجزہ کا ظہور حق تعالیٰ ہی طرف سے ہوتا ہے۔

نہ کہ پیغمبر کے اختیار و قدرت سے۔ اَخْلُقُ کے ذیل میں یہ سمجھ لیجئے کہ فعل خلق کی نسبت جب انسان کی جانب ہوتی ہے، تو مراد کسی فعل کے اندازہ کرنے اور ایک خاص اندازے اس کے درست رہنے کی ہوتی ہے حضرت عیسیٰ کی زندگی معجزات کے لئے مشہور رہی ہے عوام بجائے دلائل و شواہد عقلی کے ہمیشہ معجزات و خوارق ہی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہودی تو اپنی اعجوبہ پسندی اور طلب خوارق میں کچھ اور بڑھے ہی ہوئے تھے

کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ یعنی پرندوں کی شکل کے کھلونے مٹی سے بنا دیتا ہوں۔

فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا۔ یعنی میرے نفخ دم سے ان میں جان پڑ جاتی ہے۔

اس معجزہ کا ذکر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں کی چاروں مستند انجیلوں میں تو نہیں ہے البتہ قبطی کلیسا (coptic church) کی جو مستند انجیل ہے اس میں یہ صاف مذکور ہے، جیسا کہ ڈاکٹر بج (Budge) نے اپنی کتاب (The Legends of our Lady Mary) کے مقدمہ ص ۲۹ پر نقل کیا ہے۔

"وہ پرندوں کی شکل کے جانور بنا دیتے تھے، جو اُڑ سکتے تھے"

بِاِذْنِ اللّٰہِ اور یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے میرے ارادہ و تصرف سے نہیں، بس اللہ کے حکم و اختیار سے ہوتا ہے۔

اَلْاَکْمَہَ، اندھوں کو بینا کر دینے کا ذکر انجیل میں متعدد مقامات پر ہے مثلاً انجیل متی کے باب ۹ کے آیات ۲۷، و ۳۰ میں ہے۔ اور انجیل مرقس کے باب ۸ آیات ۲۲ تا ۲۵ میں اور سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا کے باب ۹ کے آیات ۱ تا ۷ میں ہے۔ اور ان میں تصریح اندھے مادر زاد ہونے کی بھی ہے۔

اَلْاَبْرَصَ، کوڑھیوں کا بھی ذکر انجیل میں دو جگہ ہے۔ انجیل متی باب ۸ آیات ۱ تا ۲ میں ایک کوڑھی کی شفایابی کا اور انجیل لوقا باب ۱۷ کی آیات ۱۱ تا ۱۹ میں دس کوڑھیوں کے بالکل اچھے ہونے کا۔

اُحْیِ الْمَوْتٰی۔ اب رہا معجزہ احیاء اموات تو برناباس میں تو اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ ص۴۳۷ و ص۱۴۴ انگریزی ایڈیشن مطبوعہ آکسفورڈ۔ باقی دو انجیلیں جو نصرانیوں کو مسلّم ہیں وہ بھی اس کے حوالوں سے خالی نہیں۔ مثلاً انجیل لوقا باب ۷، آیات ۱۱ تا ۱۶ نیز آیت ۲۲۔ انجیل متی باب ۹، آیات ۱۸۔ ۲۵، اور انجیل یوحنا باب ۱۱۔ آیات ۱۔ ۴۴۔ تاکید اور تصریح کے لئے بِاِذْنِ اللّٰہِ مکرر آیا ہے، کہ کہیں ان خوارق و تصرفات کو میری جانب نہ منسوب کر دینا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا محض حق تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ ہے۔ اور آخر میں جو ذکر آپ نے لوگوں کی ذخیرہ کی ہوئی چیزوں کی اطلاع دہی کا کیا ہے، وہ ایک مثال اور نمونہ ہے اس حقیقت کا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مخفی چیزوں پر مجھے بھی مطلع کر دیتا ہے آپ سے خوارق و عجائب کا صدور اس کثرت سے ہوا کہ انھیں کو دیکھ کر یہود نے آپ کو شعبدہ باز کہنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کا ذکر پہلی صدی عیسوی کے جوزیفس کی کتاب تاریخ آثار یہود (History of Jewish Antiquities) میں اسی حیثیت سے آیا ہے۔ بلکہ اس وقت تک بھی جیوش انسائیکلوپیڈیا کی جلد ۷ کے ص۱۶۷ پر یوں لکھا چلا آتا ہے۔

> "یسوع نے بحیثیت معلّم دین یا قانون ساز کے نہیں، بلکہ بحیثیت شعبدہ باز کے اپنی زندگی میں شہرت و ناموری گلیل کے سادہ مزاج باشندوں سے حاصل کی"۔

نیا نبی یا پرانے نبی کی تردید و تغلیط کے لئے نہیں آتا بلکہ ہر جدید پیامبر پرانے پیامبر کی تجدید و تکمیل و تصدیق ہی کے لئے ہوتا ہے اور یہی بات آپ بھی فرما رہے ہیں کہ میں اپنی پیش رو کتاب توریت کی تصدیق کے لئے آیا ہوں"۔

قانونی جزئیات اور فقہی فروع میں تسہیل و ترمیم، عمومی تصدیق و تائید کے ذرا بھی منافی نہیں حضرت مسیح کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارے حبروں اور ربیوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں خلط ملط کر دیئے ہیں میں اس سارے بوجھ کو

تم سے دور کرنے آیا ہوں۔

یہ ساری پیش خبریاں مسیح کی زندگی میں پوری ہوتی چلی گئیں۔ ان آیتوں کے بعد مسیحؑ کی زندگی کے اصل واقعات شروع ہوتے ہیں۔ جب مسیح کی زندگی میں بجز تھوڑے سے حواریوں (ماہی گیروں) کے اور کوئی ان پر ایمان نہ لایا۔ بلکہ ان کی تکذیب و تحقیر ہی پر مصر رہے، تو اس وقت کا منظر:۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ۭ
قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ج

جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے انکار ہی پایا، تو بولے میرا کون مددگار ہوگا اللہ کے لئے تو حواری بولے کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

یعنی جب مسیح اپنی ساری سعی و تبلیغ کے باوجود یہود کے عمومی رویہ سے سخت دکھ اٹھاتے رہے اور ان کی طرف سے انکار ہی تمرد و طغیان کے ساتھ پاتے چلے گئے، تو قوم کو نصرت دین کے لئے آواز دی۔ اس پر حواری بولے کہ ہم حاضر ہیں۔

لفظ حواری پہلی دفعہ آیا ہے، تو اس کا مفہوم بھی سمجھتے چلیے۔

حواری کے لفظی معنی کپڑے کو دھونے اور اسے اُجلا اور صاف کر دینے والے کے ہیں۔ اور حضرت کے ابتدائی ماننے والے سمندر کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر ہی تھے۔ اس لئے اس کے بعد آپ کے رفیقوں اور صحابیوں کا لقب ہی حواری پڑ گیا۔ اور مجازی معنی مخلص و مطیع کے بھی قرار پا گئے۔″

چنانچہ حدیث میں حضرت زبیر صحابی کے لئے حواری رسول کا لقب آیا ہے۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آیت ۵۲)

ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور آپ گواہ رہئے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا

مَعَ الشَّاهِدِيْنَ ۝ (آیت ۵۳)

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے اس پر جو کچھ آپ نے اُتارا ہے اور ہم نے پیروی اختیار کی ان رسول کی سو ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرتے ہیں۔

یہ اہل کتاب ہر دور کے سچے مسلمانوں کی طرح توحید کے پورے طور پر قائل تھے اور "ابن اللہ" اور "اقنوم" وغیرہ کے تخیل سے بھی نا آشنا۔ مسیح کے یہ صحابی مسیح سے گفتگو کرتے کرتے غلبۂ توحید سے براہ راست اللہ سے مناجات کرنے لگے ہیں۔ قرآن مجید نے ایسے موقعوں پر بار بار یہ کیا ہے کہ بندوں کی گفتگو کا رُخ دفعتہً اللہ سے مناجات کی طرف پھیر دیا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا۔ اس مکالمہ کے بعد جو کچھ گزری اسے بجائے تفصیل کے قرآن مجید نے اس موقعہ پر کمال ایجاز سے دو ہی لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝ (آیت ۵۴)

اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی، اور اللہ بہترین خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔

لفظ مکرؔ، اللہ کی جانب منسوب کرنے سے آپ وحشت نہ کریں۔ یہ اُردو کا مکر نہیں۔ جو ہمیشہ برائی ہی کے موقع پر آتا ہے اور جس کا مرادف فریب اور دھوکا ہے۔ یہ عربی کا مکر ہے جس کے معنی صرف خفیہ تدبیر کے ہیں۔ یہ بُرے اور اچھے ہر موقع کے لئے عام ہے

حضرت مسیح پر مقدمہ چلنے اور پھر عدالت سے حکم سزا پانے کے بعد آپ جس طرح نفاذ سزا سے محفوظ رہے، یہ ساری داستان ایک دوسری صحبت میں تفصیل سے سُنئے گا۔

(۳۴)

اسی سلسلہ میں چند آیتوں کے بعد ذکر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا آتا ہے۔ اب

وہ ملاحظہ ہو:

إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ
تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (آیت ۵۹)

بے شک حضرت عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کے حال کی طرح ہے، اللہ نے ان کو مٹی سے بنایا۔ پھر کہا جاندار ہو، چنانچہ وہ وجود میں آ گئے۔

یہ مثلیت عیسیٰؑ و آدمؑ کے درمیان کس حیثیت سے، جواب ہے کہ بشر محض اور حادث مخلوق ہونے کا اشارہ عیسائیوں کے عقیدہ ابن اللّٰہیت کی جانب ہے۔ سوال انھیں سے ہو رہا ہے کہ تم عیسیٰ کو فوق البشر کیسے مان رہے ہو؟ اگر یہ کہو کہ وہ بغیر باپ کے توسط کے پیدا ہوئے، اس لئے فوق البشر ٹھہرے، تو پھر آدم کو بھی فوق البشر کیوں نہیں مانتے وہ تو عیسیٰ سے بھی عجیب تر صورت سے پیدا ہوئے یعنی ماں اور باپ دونوں کے توسط کے بغیر۔ اللہ کسی بشر کے پیدا کرنے پر کسی مخصوص، متعین طریقہ، وجود و ظہور پر مجبور نہیں۔ مطلق مشیت اس کے لئے کافی ہے۔ اور یہی تو آفرینش عیسیٰ میں پوری طرح مؤثر تھی

حضرت عیسیٰ کے بے باپ کے پیدا ہونے پر کوئی صراحۃ النص قرآن مجید میں نہیں، لیکن اتنے کھلے ہوئے اشارے اور قرینے موجود ہیں، جو اس عقیدے کو قریب بہ صراحت بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔

خود مسیحیوں میں ایک قدیم فرقہ (Arians) کا ہوا ہے۔ اس کا بانی Arius چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کا لاٹ پادری تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم کی جلد اول ص ۵۰۲ پر اس کی تعلیم بھی درج ہے کہ مسیح قدیم و غیر مخلوق نہیں۔ مخلوق و حادث ہیں۔ اور ان سے بھی قبل تیسری صدی عیسوی میں انطیوخ (انطاکیہ) کے بطریق پال کی تلقین بھی یہی تھی کہ عیسیٰ مسیح کی پیدائش ایک دوشیزہ کے بطن سے ہوئی تھی۔ بہ واسطہ روح القدس اس لئے تھے وہ بشر محض، ہاں روح القدس کے توسط نے انھیں مقدس

بھی بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ مسیح بھی تھے۔ لیکن شریک الوہیت بہر حال نہ تھے۔ اس عقیدہ کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس جلد ۱۱ ص ۱۷۱

مسیحیوں کے صاحب فہم طبقہ میں اصلاحی تحریکیں صحیح عقیدہ کی برابر اٹھتی رہی ہیں۔ لیکن کلیسا کے عام جمود و تصلّب نے کبھی ان اصلاحوں کو آگے بڑھنے اور سرسبز نہ ہونے دیا۔ خود آج بھی مسیحیوں میں ایک فرقہ موحدین (Unitarians) کے نام سے موجود ہے جس میں بڑے بڑے مشہور قابل فاضل ہوئے ہیں۔ مثلاً آنجہانی ایل، پی جیکس (L.P.JACKS) ایڈیٹر۔ ہیبرٹ جرنل (HIBBERT JOURNAL) اس کی تعلیم بھی اس سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ یہ فرقہ تثلیث کا بالکل منکر و مخالف ہے اور حضرت مسیح کو افضل البشر اور برترین انسان مانتا ہے۔ لیکن ان کی الوہیت کا قائل کسی درجہ میں بھی نہیں

(۳۴)

اور اسی مکالمۂ مسیح و مسیحیت کے تتمہ کے طور پر وہ آیت بھی ملاحظہ ہو جائے، جس کا تعلق سیرت نبوی کے ایک اہم واقعہ سے ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ کے قیام کو نو سال ہو چکے تھے اور حجاز پر پورا تسلط مسلمانوں کا قائم ہو چکا تھا کہ سنہ ۹ ھ میں نجران (NAGRAN) کے مسیحیوں کا ایک وفد چودہ ارکان پر شامل خدمت میں حاضر ہوا، گفتگو الوہیت مسیح پر رہی، اسلامی عقیدہ یعنی بشریت مسیح کی معقولیت بالکل واضح و ظاہر تھی۔ لیکن وفد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ادھر آپ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح یہ لوگ بھی دین حق قبول کر کے جنت کے وارث و حقدار بن جائیں۔ آخر میں آپ نے وہی کیا جو شاید ہر سچا اور مخلص داعیٔ حق ایسے موقع پر کرتا۔ آپ نے فرمان خداوندی کے تحت عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دے دی، کہ زبانی گفتگو تو بہت کچھ ہو چکی، اب آؤ، ہم تم اپنے خاص عزیزوں کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے پروردگار ہی سے بہ تضرع والحاح

عرض کریں کہ جو فریق ناحق پر ہو اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو، آپ نے یہ فرمایا اور اپنی اولاد حقیقی و حکمی یعنی سیدہ فاطمہؓ و سیدنا علیؓ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسینؓ کو ہمراہ لے کر تشریف لے آئے، لیکن تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ عیسائیوں کی ہمت عین وقت پر جواب دے گئی، اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ بجائے اس آزمائش میں پڑنے کے، جزیہ دے کر اور ذمی رعایا بن کر اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا کرلیا۔ //

اب قرآن کا بیان سنئے

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ تف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ٥ (آیت ٦١)

تو آپ (ان مسیحیوں سے) کہہ دیجئے کہ اچھا آؤ، ہم بلا لائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے کو بھی اور تمہارے تئیں بھی، پھر ہم خشوع سے دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔

سر ولیم میور کی سیرت محمدی (Life of Mohammed) انیسویں صدی میں اپنے موضوع پر مشہور ترین کتاب تھی اور سر ولیم میور کوئی مسلمان نہیں، مسیحی تھے، اور محض مسیحی ہی نہیں، مشنری یا مبلغ مسیحیت بھی۔ اپنی اسی کتاب میں صفحہ ۳٦٠ پر واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

> واقعہ میں محمدؐ کے ایمان کی پختگی بالکل نمایاں ہے: نیز ان کے اس عقیدہ کی شہادت کہ ان کا تعلق عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لئے کہ حق تمام تر انھیں کے ساتھ ہے۔ اور یہ کہ ان کے خیال کے مطابق مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے کچھ نہ تھا۔ //

۵/۱۱/۹۴

۳۵

توحید پر زور تو قرآن مجید میں بے شمار بار آیا ہے۔ یہاں بھی دو آیتوں کے بعد اہل کتاب نصرانیوں سے خطاب اس موضوع پر زوردار انداز سے ہے:۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا
وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آیت ۶۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب آجاؤ ایسے معمول کی طرف جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم بجز اللہ کے کسی کی پرستش نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائیں، پھر اگر وہ شبہ کریں تو تم کہہ دو (اے مسلمانو) کہ تم گواہ رہنا ہم تو بہرحال فرمانبردار تھے۔

سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ یعنی وہ بنیادی عقیدہ جو ہم مسلمانوں اور تم نصرانیوں دونوں کو مسلّم ہے اور وہ دونوں میں مشترک ہے جس کی قدر و قیمت اور افادیت پر سب کو اتفاق ہے اور جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیمبران برحق ہمیشہ دیتے آئے ہیں، اور یہودیت و نصرانیت دونوں دینوں کی بنیاد ہی اسی اصل پر ہے

توریت تو خیر تاکید توحید اور رد شرک سے لبریز ہی ہے، انجیل میں بھی تعلیم یہی موجود ہے۔ متی باب ۴ کی آیت ۱۰ میں ہے:

"تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر"

اور یہ تو ساری انجیلوں میں کہیں بھی نہیں ملتا ہے، نہ صراحۃً نہ دلالۃً نہ اشارۃً کہ کچھ پرستش تو صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں ابن اللہ اور روح القدس کو بھی

شریک کر لیا کرو۔ /

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، مخلوق پرستی اور مخلوق کی شرکت اُلوہیت کی تردید تو آپ سُن ہی چکے۔ اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہو رہی ہے۔ غیر اللہ جس طرح معبود و الٰہ نہیں، اسی طرح رب و مطاع مطلق بھی نہیں۔ نصرانیوں نے طرح طرح کے شرک نکال لئے تھے، اسی طرح عصمتیں بھی طرح طرح کی گڑھ رکھی تھیں۔ پاپائے روم کی معصومیت، کیتھولک دنیا، اور کلیسا یعنی پادریوں کے اجماع کی معصومیت کل مسیحی دنیا کا متفقہ عقیدہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع چہاردہم، جلد ۱۶ ص ۶۳۰ پر یہ عقیدہ یوں درج ہے:

> "ایک مخصوص کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے۔ اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہی نہیں"۔

قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگا دی، اور کسی کو رب ٹھہرانے کے لئے یہ لازمی نہیں کہ لفظاً و قولاً اسے رب ہی کہا جائے۔ کسی فقیہہ کو، مرشد کو، امام کو اگر معصوم مان لیا اور اس کے قول کو دلیل سے بے نیاز قرار دے لیا تو یہ اسے رب ہی مان لینا ہوا۔ //

بَعْضُنَا بَعْضًا سے مفسر ابن حیان غرناطی نے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ الوہیت و ربوبیت دونوں کی تردید تو اسی ایک فقرے سے ہو گئی۔ جب ایک دوسرے میں مثلیت اور رشتہ ہم نسبی کا قائم ہو گیا تو سب بندے ہونے کی حیثیت سے برابر ہو گئے۔ اور الوہیت و ربوبیت اب باقی ہی کہاں رہ گئی۔

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ، قرآن کے اعجازی انداز بیان کا ایک اور نمونہ۔ اہل کتاب نصرانی یا یہودی تو آج بھی اسلام کی توحید خالص کی گواہی دے رہے ہیں۔ اور وہ اپنی کتابوں میں لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلم قوم توحید خالص کی حامل ہے۔

(۳۶)

یہ بنیادی حقیقت کہ دین مقبول اللہ کے ہاں صرف اسلام ہی ہے نہ کہ ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے پکارا جاتا ہے، پہلے بھی بیان ہو چکی تھی اور اسی سورہ آل عمران میں

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔

دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔

یعنی اسلام اپنے اصطلاحی معنی میں، ورنہ لفظی معنی میں تو ہر جھک جانے کو اسلام ہی کہتے ہیں

اب یہاں اس سے بڑھ کر قطعی صورت میں اعلان ہوتا ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ
وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ٥ (آیت ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین (اپنے لئے) تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا۔ اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں ہوگا۔

تاکید در تاکید دیکھیئے، اثباتاً و نفیاً دونوں طریقوں سے بیان کا ماحصل یہی ہے کہ دین نجات دلانے والا، آخرت میں کام آنے والا دین، تو بس یہی اسلام ہی ہے۔ جس کی کتاب قرآن ہے، اور جس کے لانے والے محمد رسول اللہ ہیں۔ اس ایک دین کے سوا اور جتنے بھی دین اپنی موجودہ صورت میں موجود ہیں، ان کی مثال فرسودہ اور ٹکسال باہر سکوں کی ہے کہ کہنے کو سکے تو وہ بھی ہیں۔ لیکن وہ سکے جب بازار میں چل نہ سکیں، تو ان کا سکہ ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دوسرے دین و مذہب اصلاً کیسے ہی رہے ہوں ان کی موجودہ صورت میں انھیں دین حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین و مذہب کو

نجات کے لئے کافی سمجھنا، یا سب مذہبوں کو ملا جُلا کر ان کا ایک ملغوبہ تیار کر نام یہ کہنا کہ دیر و حرم، کعبہ و کلیسا، شیخ و برہمن، مسجد و بت کدہ، سب یکساں ہیں اور ایک حکم میں داخل، یہ سب ضلالت و بے دینی ہی کی شکلیں ہیں کہ اکبر و فیضیؔ، ابو الفضل، دارا شکوہ، وغیرہ ان ناکام کوششوں کے لئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں اور وحدت ادیان کے نام سے آج بھی بعض اہل قلم اسی نامراد مرض میں مبتلا، اپنی روشن خیالی اور رواداری کے پردے میں اعلان اسی بد دینی کا کر رہے ہیں ۔

(۳۷)

خانۂ کعبہ کی قدامت بھی اہل کتاب کے لئے ایک مختلف فیہ مسئلہ رہی ہے۔ قرآن مجید نے اس کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے، پہلے ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحیح مقتدائی اور پیشوائی کا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ قف فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ط وَ مَاکَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ آیت ۹۵

آپ کہہ دیجئے (اے رسول) کہ اللہ نے سچی بات فرما دی تو تم پیروی کرو سیدھی راہ پر چلنے والے ابراہیم کے دین کی اور وہ تو مشرکین میں سے نہ تھے ۔

یعنی قرآن نے امر حق واضح کر دیا اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے ہی مقدس مقدس نوشتوں پر باندھے تھے، ان سب کی قلعی کھول دی ۔ تو تم سب، کیا اہل کتاب اور کیا مشرک، ابراہیم ہی کی پیروی کرو۔ اور خود بھی سچے اور ان کا لایا ہوا دین بھی سچا۔ اور جنھیں تم بھی اپنا پیشوا مانتے ہو۔ ان میں تو بہر حال کہیں سے بھی شائبۂ شرک نہ تھا ۔

اور اس کے معاً بعد ذکر ان کے شہر مکہ اور ان کی تعمیر کعبہ کا ہے ۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ج آیت ۹۶)

بے شک سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کے لئے) برکت والا اور سارے جہاں والوں کے لئے رہنما۔

دنیا میں پہلا مکان بہ طور عبادت گاہ کے، یعنی خانۂ کعبہ، جس کی روایات حدیث کے مطابق ابتدائی تعمیر حضرت آدمؑ نے کی تھی اور منہدم ہونے کے بعد، پھر اس کی از سر نو تعمیر حضرت خلیلؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

قرآن کریم دعویٰ سے کہتا ہے کہ قدیم ترین عبادت گاہ اس سر زمین پر ہے، اور دیکھیے، کہ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ (HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD) والے کیا کہتے ہیں۔

" یہ پتھر کی مربع عبادت گاہ جس کی عمر نامعلوم قدامت کی ہے، مکہ کے حدود کے اندر تھی" (جلد ۸ ص ۱۰۵)

اور پھر کہتے ہیں:۔

" نسلہا نسل سے یہ مقدس ترین عظمت کی حامل رہی ہے۔ اور اس کی بابت عقیدہ یہی رہا ہے کہ خود یہوداہ (خدا) نے اسے عرب قوم کو بہ طور تحفہ دے دیا تاکہ وہ دوسری قوموں پر اس قوم کے تفوق کی گواہ رہے۔

یہ ابراہیم اور ان کے فرزند اسمٰعیل کا عبادت خانہ بیت اللہ رہا ہے" (جلد ۸ ص ۱۶۸)

گویا اس کی قدامت کی تاریخ، تاریخ کے حافظہ میں بھی نہیں۔ اتنی غیر معمولی قدامت فرنگی فاضلوں کو بھی تسلیم ہے اور اس کا شروع ہی سے عبادت خانہ ہونا مسلّم ہے۔ کعبہ کو قدیم ترین عبادت گاہ کہہ کر یہود کو بتا دیا گیا کہ یہ بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔

اور سنئے عہد نامہ عتیق میں اتنی تحریف و تصرف کے باوجود بھی ایک جگہ ذکر بکہ کا باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ زبور داؤد کی مناجات ۸۴ کی آیت ۶ میں ہے۔

" وہ بکہ کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے"

اور بائبل کے قدیم مترجموں نے ترجمہ میں اپنی بے احتیاطی کی عام عادت کے مطابق اسے بجائے علم اور اسم مکان قرار دینے کے اسم نکرہ قرار دے دیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ "رونے کی وادی" کر ڈالا۔ صدیوں کے بعد اب غلطی کا احساس ہوا، اور اب جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اقرار ہے کہ یہ ایک مخصوص بے آب وادی کا نام ہے (جلد ۲ ص ۱۱۵) اور اب جتنا قریب آ گئے ہیں تو اللہ انھیں یہ لکھنے کی توفیق اور دے کہ یہی وادی بے آب مکہ معظمہ ہے۔

بکۃ۔ مکہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ عربی علم الصرف کے ایک قاعدہ کے مطابق میم اور ب کے درمیان تبادلہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لازم اور لازب اور راتم و راتب کی مثالیں ہیں۔

اسی قاعدہ کے ماتحت مکہ بکہ کا مرادف و متبادل ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ نام ہے کل شہر کا۔ اور بکہ کا اطلاق ہوتا ہے مسجد حرام اور مطاف پر۔

ان مختصر لفظوں میں اس کی دو صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ ایک مُبارکًا یہ وہ مقام ہے جہاں مادی اور روحانی، دینی و دنیوی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

دوسرے ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ سارے جہاں کے لئے مرکز ہدایت ہے۔ بہ طور قبلہ کے

اور مؤرخ مسعودی نے اہل جاہلیت کا یہ عقیدہ نقل کیا ہے کہ بیت الحرام ستارہ زحل کا ہیکل (مندر) ہے اور زحل اس کا مربی ہے۔ اور چونکہ زحل کی صفت بقائے دوام ہے۔ اس لئے جو چیز بھی اس کی جانب منسوب ہو گی اسے بھی زوال نہ ہوگا۔ اور اس کی تعظیم و تکریم سدا باقی رہے گی۔

عقیدۂ جاہلیت کا سہی تاہم اس سے شہادت تو کعبہ کی قدامت کی مل ہی جاتی ہے۔

(۳۸)

قرآن مجید کی چوتھی سورت کا نام سورہ النساء ہے۔ اور نساء کہتے ہیں عورتوں کو۔ اس لمبی سورۃ میں بیشتر بیان عورتوں کے مسائل اور ان کے احکام اور عورتوں کے حقوق و فرائض کا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں کتنا بڑا دخل اور کتنی اہمیت عورت کو حاصل ہے۔ علاوہ بیسیوں متفرق عنوانات کے ایک مستقل سورۃ ہی اس موضوع پر ہے۔ پہلی ہی آیت کتنے مختلف پہلوؤں پر شامل اور کیسی کیسی حکمتوں کی جامع ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اے لوگو تقوےٰ اختیار کرو اپنے پروردگار کا جس نے تم (سب) کو ایک جان سے پیدا کیا۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ خطاب قریش، بلکہ محض اہل عرب سے بھی نہیں، بلکہ سارے ہی انسانوں، نوع بشر سے ہے۔

یہ عنوان خطاب بجائے خود پیام اسلام کی عالمگیری کا اعلان کر رہا ہے۔ انسان کسی نسل، کسی رنگ کا ہو، بہر حال ایمان کا بلکہ کسی حد تک تقوےٰ کا مکلف ہے۔ النّاس یوں سارے نوع بشر کے لئے ہے۔ اور پھر جب سورت مکی ہے بھی نہیں۔ بالاتفاق مدنی ہے۔

اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ اللہ سے ڈرنا دراصل اس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات بجائے خود کوئی خوف کھانے والی چیز نہیں۔ بلکہ سر تا سر محبت و عظمت ہی کے قابل ہستی ہے اور لفظ رَبَّكُمْ لا کر اشارہ کر دیا ہے کہ جن احکام کی

مخالفت سے ڈرایا اور روکا جا رہا ہے۔ ان سے مقصود تمامتر بندے ہی کی ربوبیت اور پرورش ہے۔

خَلَقَکُمْ مسئلۂ ارتقاء جس حد تک اور جس معنی میں بھی صحیح ہو، قرآن مجید کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ وہ زور صرف اس پر دیتا ہے کہ انسان چاہے بتدریج ہی وجود میں آیا ہو، بہرحال اللہ کا خلق کیا ہوا، نیست سے ہست میں اللہ ہی کا لایا ہوا ہے۔ وہ ضرب انسان کی خود وجودی پر لگاتا اور اثبات اس کی مخلوقیت کا کر رہا ہے۔ ا

مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ، یعنی ابو البشر آدم علیہ السلام سے۔ وحدتِ نسل انسانی کا سبق اپنے علمی اور دور رس نتائج کے لحاظ سے بڑا ہی اہم ہے۔ آخری مورث اعلیٰ ہر فرد بشر کے، ہر کالے اور ہر گورے کے، ہر برہمن اور ہر شودر کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے، ابو البشر حضرت آدمؑ ہیں۔ یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورث اعلیٰ کوئی ہوں، اور فلاں نسل کے کوئی اور۔ اور نہ یہ کہ برہمن نسل کے لوگ برہما جی کے سر سے پیدا ہوئے اور چھتری نسل والے برہما جی کے سینے سے اور ویش ان کی ٹانگوں سے ا ـــــ اصلاً سب انسان ایک ہی ہیں۔ آج کا انسان اگر اسی ایک سبق کو یاد رکھ لے تو جنگیں اور خوں ریزیاں کتنی کم ہو جائیں اور معاً بعد یہ ارشاد ہوتا ہے وَخلق منہا زوجہا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، یعنی حوّا زوجۂ آدم علیہ السلام کو۔ یہ تخلیق کس طرح سے ہوئی ہے اس کے ذکر سے قرآن مجید بالکل خاموش ہے اور حدیث بھی تقریباً ـــ جس سے معلوم اور معروف روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ آدم کا نہ حوّا کا۔ اس میں بیان محض عورت کی کج سرشتی کا ہے۔ مِنْهَا میں هَا کی ضمیر عموماً نفس کی طرف راجع سمجھی گئی ہے لیکن ایک دوسرا قول بھی تفسیروں میں نقل ہوا ہے کہ مِنْهَا یہاں جِنْسِهَا کے معنی میں ہے۔ کبیر میں ابو مسلم اور بحر المحیط میں ابن حجر کے حوالہ سے اور جنس عورت کے معنی لیکر

تو حضرت حوّا کی ذات کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

یہ روایت تو صرف توریت مروجہ کی ہے کہ خدا نے آدم کی ایک پسلی ان کے سونے کی حالت میں نکالی اور نکالی ہوئی پسلی سے ایک عورت پیدا کر کے آدم کے پاس بھیجدی۔ اور یہ روایت صحیفۂ پیدائش باب دوم کی آیت ۲۲-۲۳ میں ہے۔

رہی حدیث نبوی تو جس حدیث کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے تو وہاں ذکر نہ حضرت آدم کا ہے نہ حضرت حوّا کا بلکہ محض عورت کی جنس کی پیدائش اور اس کی کج سرشتی کا ہے۔ پھر یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ حدیث میں حضرت حوا کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے بطور استعارہ ارشاد کر دی گئی ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی یا عجلت پسندی سے ہوئی ہے۔ اور تفسیر بحر المحیط میں اسی پہلو کو پیش کیا گیا ہے، اور اس معنی کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حوّا کو اس طرح پیدا کیا گیا، بلکہ جنس عورت کا ذکر ہے اور یہ بہ آسانی مجاز و استعارہ پر محمول ہو سکتا ہے۔ چنانچہ لغت حدیث مجمع البحار میں یہ قول کرمانی کے حوالہ سے نقل ہوا ہے اور ایک حاشیہ تفسیر ابن کثیر میں بھی ایسا ہی نقل ہوا ہے۔

اور خود ایک حدیث نبوی صحیح بخاری کی کتاب النکاح میں اور صحیح مسلم کی کتاب الرضاع میں اس مضمون کی نقل ہوئی ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے اور لغت میں خود ضلع کا مفہوم تو ثانوی ہی ہے۔ ورنہ اصل معنی تو کجی یا میل یا انحراف ہی کے ہیں۔ زمخشری کی مشہور لغت حدیث کتاب الفائق میں ہے الضلع المیل یعنی ضلع جھکاؤ کو کہتے ہیں اور اسی سے ملتی ہوئی عبارت ابن اثیر کی لغت حدیث نہایہ کی ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً ۚ

اور پھیلا دیے ہم نے ان دونوں سے مرد اور عورت کثرت سے

دنیا کی انسانی آبادی اب تک جتنی ہو گئی اور جتنی قیامت تک ہو گی سب اسی سے ہو گی۔ لفظ کثیر کا اطلاق اگر اس ان گنت آبادی پر بھی نہ ہو گا تو اور کس پر ہو گا؟

خیال اس سلسلہ میں صرف یہ رہے کہ یہ نسل غیر محدود و غیر معدود حضرت آدمؑ ہی کی نہیں بلکہ آدمؑ و حواؑ دونوں کی ہے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ

اس اللہ سے تقوے اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی۔

تقویٰ الٰہی یا ادائے حقوق اللہ کا حکم ابھی ابھی مل چکا ہے، اور ایک ہی آیت کے اندر دوبارہ پھر مل گیا۔ جتنی تاکید اس سے مقصود ہے ظاہر ہی ہے، لیکن اب کی جو حکم تقویٰ علاوہ ارحام یعنی عزیزوں یا قرابت داروں کے باب میں ہے، اور الارحام کا عطف اللہ پر ہے اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس طرح محتاط حقوق اللہ کے باب میں رہتے ہو۔ اسی طرح قرابتوں کے معاملہ میں بھی رہو۔ یہ ہے قرابت یا رشتہ داری کی اہمیت اسلام میں!

درحقیقت اُمت کے نظام اجتماعی کا سنگ بنیاد ہی شریعت نے خاندان کو قرار دیا ہے، عزیزوں، قریبوں، خاندان اور برادری والوں کے ساتھ حُسن سلوک اسلام میں کوئی دوسرے درجہ کی نہیں۔ اول درجہ کی اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ اور اس معنی میں ایک حدیث نبوی بھی ہے کہ رحم یعنی رشتہ قرابت اللہ سے دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے رکھتا ہے اللہ اسے جوڑے رہے۔ اور جو مجھے قطع کرتا ہے اللہ اسے قطع کرے اور آیت کا خاتمہ اس ٹکڑے پر ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ۝ (آیت ۱)

بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔

یعنی اس حکم کو ہلکا اور سرسری نہ سمجھو، وہ عالم الغیب جس طرح تمھاری عبادتی زندگی کا نگراں ہے اسی طرح وہ تمھارے خانگی، اجتماعی سارے ہی معاملات کا نگراں ہے! — آج اس حکم کا استحضار اگر دلوں میں رہے تو اُمت کے اندر اس قدر تلخیوں، رنجشوں خانہ جنگیوں کا وجود کہیں باقی نہ رہ جائے؟ لیکن بہر صورت جہاں تک کتابی تعلیم کا تعلق ہے، اسلام خانگی حقوق اور ذمہ داریوں کی تاکید کے لحاظ سے بس آپ ہی اپنی مثال ہے۔

(۳۹)

مذہب کے دائرے میں ایک اہم مسئلہ توبہ اور قبول توبہ کا آتا ہے، گناہ نام ہے کسی حکم الٰہی کی دانستہ خلاف ورزی کا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بشری فطرت کی کمزوری کے لحاظ سے گناہوں کا صدور تو ناگزیر سا ہے، تو اب گرفت اور عذاب الٰہی سے بچنے کی کوئی راہ بھی ہے! بعض مذہبوں نے کرم یا مکافات عمل کے قانون کے نام سے اس باب کو سرے سے بند ہی کر دیا ہے، یہ کہہ کر کہ ہر شخص کو اپنے ہر عمل کا نتیجہ ہر حال میں بھگتنا ہی پڑے گا، اور بعض مذہبوں نے اس کے برعکس معافی کا دروازہ شفاعت کے تحت میں لا کر اتنا وسیع کر دیا ہے کہ کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہ جاتا۔ جب ایک مستقل اور مطلق شافع موجود ہے، تو پھر وہ ہر مجرم کو چھڑا ہی لے گا اور جزا کا قانون سرے سے معطّل و مہمل ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔

قرآن نے حکیمانہ راستہ توسط و اعتدال کا اختیار کیا ہے، اس نے ہر اختیاری جرم کے لئے ندامت، پچھتاوے کی راہ کھلی رکھی ہے، جب بھی مجرم کو اپنی غلطی، غلط کاری کا احساس ہو جائے، اس کا عملی تدارک تلافی اور کفارے سے کر دے اور اگر اس کی گنجائش ہی نہ باقی ہو تو حاکم مطلق کی بارگاہ میں معافی پیش کرے پچھتائے، گڑگڑائے، روئے دھوئے، وہ غفورٌ رّحیم توبہ قبول کرے گا، اور اسے معافی کا پروانہ عنایت کر دے گا — ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (آیت ۱۷)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے، وہ تو بس انھیں لوگوں کی ہے، جو بری حرکت نادانی سے کر گزرتے ہیں، اور پھر قریبی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے، اور اللہ بڑا علم والا بڑا حکمت والا ہے /

يَعْمَلُونَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ۔ سُوْء کا لفظ عام ہے، چھوٹی بڑی ہر ہر معصیت کے لئے / جہالت کے معنی نادانی کے ہیں۔ یہاں مجرم کی نفسیت بیان کی ہے کہ جرم کے ارتکاب کے وقت اس کے نتائج کا ذہن سے ذہول ہو گیا۔ اور عقل سلیم غلبۂ ہیجان نفس سے وقتی طور پر اندھی ہو گئی۔ عَلَى اللّٰهِ اللہ کے ذمہ۔ حقیقۃً تو اللہ پر واجب کوئی بھی چیز نہیں۔ یہاں قبول توبہ کو اللہ پر واجب تاکید کے معنی و مفہوم میں فرما دیا گیا ہے۔

مِنْ قَرِيبٍ ، توبہ جتنی جلد کر لی جائے، یعنی غلبۂ نفس اور مغلوبیت عقل کے وقت جو گناہ سرزد ہو جائے اس پر پشیمانی اور اس عمل سے باز رہنے کا عزم جس قدر جلد قائم کر لیا جائے، اتنے ہی قبول توبہ کے موقع زیادہ رہتے ہیں۔ اور جتنی اس میں تعویق و تاخیر ہوتی چلی جائے گی، اسی قدر قبول توبہ کے امکانات بھی ضعیف ہوتے جائیں گے۔ لیکن شریعت نے عین شفقت و رحمت اور بندہ نوازی سے کام لے کر اس قرب کی میعاد عین حضور موت سے قبل تک وسیع کر دی ہے۔ ابن عباسؓ صحابی اور متعدد تابعین سے آیت کی شرح و تفسیر میں یہی منقول ہے۔

كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وہ اپنے مرتبۂ علم کے لحاظ سے خوب جانتا ہے کہ کون مخلص ہے اور دل سے توبہ کرنے والا ہے، اور اپنی شانِ حکمت کے لحاظ سے تائبِ غیر مخلص کو بھی رسوا کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دیتا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (آیت ۱۸)

اور توبہ ان لوگوں کی نہیں، جو برابر گناہ کرتے رہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو، اور اس وقت وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ (ان لوگوں کی) جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں ان کے لئے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یعنی قاعدہ اور ضابطہ ایسے لوگوں کی بخشش کا نہیں، جو گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور انھیں کو اپنا شعارِ زندگی بنا لیا ہے۔ ان سے قبولِ توبہ کا وعدہ نہیں۔ باقی اگر کسی سے وہ غفور و رحیم رحمت و مغفرت ہی کا معاملہ کرنا چاہے، تو اس کے فضل و کرم کی راہ میں کسی کی کیا مجال جو حائل ہو سکے۔

اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ، یعنی عالمِ ناسوت کے حدود شکست ہونے کے بعد، عالمِ غیب کا مشاہدہ ہونے لگے، تو اب توبہ اختیاری نہ رہے گی، بلکہ اضطراری بن جائے گی جو مقبول کسی درجہ میں بھی نہیں۔

آیت ماقبل میں السُّوْٓءَ بہ صیغۂ واحد تھا۔ اور اب "سَیِّاٰت"

(بہ صیغۂ جمع) آگیا۔ یہ فرق قابل غور و لحاظ ہے۔ پہلی آیت میں ذکر جلد توبہ کر لینے والوں کا تھا، اور اس دوسری آیت میں ان کا ہے۔ جو اپنے گناہوں کا بوجھ نفسانیت میں ڈوب کر برابر بڑھاتے جاتے ہیں۔

وَهُمْ كُفَّارٌ۔ کافر کی توبہ کا موت کے وقت غیر مقبول رہنا پہلی آیت میں شامل تھا۔ عجب نہیں کہ یہ مزید تاکید و مزید تفضیح کے لئے ہو۔

5|1|90
5|2|90

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چوتھا خطبہ

(۴۰)

فطرت نے انسان کی تقسیم دو جنسوں میں، اس کی پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی ہے۔ نر اور مادہ، مذکر اور مؤنث، مرد اور عورت اور ان دونوں کے باہمی تعلق کا مسئلہ شروع سے نازک و پیچیدہ چلا آرہا ہے۔ پُرانی تہذیبیں تو زیادہ تر اس طرف گئیں کہ عورت ایک صنفِ حقیر و ذلیل ہے۔ مَردوں کی محکوم اور باندی۔ بچپن بھر باپ کی قید میں رہے۔ بڑی ہوکر بھائی یا شوہر کی جکڑبند میں۔ اور آخر عمر میں لڑکوں کی کڑی نگرانی میں۔ جدید تہذیب کا ردِّ عمل اس کے ٹھیک برعکس اس حد تک ہوا کہ نوبت مادر پدر آزادی کی آگئی۔ اب دیکھیے کہ قرآن اس مسئلہ کو کس حکیمانہ و عادلانہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ سورۃ النساء تو ہے ہی خاص عورتوں کے مسائل کے لئے، اس کی آیت ۳۲ ملاحظہ ہو:

> وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ
>
> اور تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو، جس میں اللہ نے بڑائی دے رکھی ہے تم میں سے ایک دوسرے پر۔

بڑائی سے مراد ہے طبعی اور وہبی طور پر بلا دخل کسی عمل و کسب کے، مثلاً کوئی دولت مند ہے، کوئی حسین و جمیل ہے، کوئی خوش گلو ہے، کسی کے قوائے جسمانی بڑے مضبوط ہیں، اس قسم کے طبعی و وہبی فضائل کو قربِ حق میں مطلق دخل نہیں، اور ان کی بناء پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کے مثل و مانند ہونے کی حسرت و تمنا کرنا

درست نہیں۔ قربِ حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے، رحمت و مغفرت و قربِ حق کا مدار تو اعمال ارادی و اختیاری پر ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ

مَردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصّہ (ثابت) ہے، اور عورتوں کے لئے اُن کے اعمال کا حصّہ (ثابت) ہے۔

اور اس حیثیت سے مرد اور عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے۔ عورتوں کے لئے بھی قانون وہی ہے جو مَردوں کے لئے۔ یہ فرق محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دئے گئے ہیں۔ ان میں رشک و حسرت کا کوئی محل نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا کہ مرد کا کچھ اجر اس کے مرد ہونے کی بنا پر بڑھ جائے، یا عورت کا کچھ اجر اس کے عورت ہونے کی بنا پر گھٹ جائے۔ ایک مکلّف بشری مخلوق ہونے کی حیثیت میں، اس میں اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ مرد، مرد ہونے کی حیثیت سے ہرگز اللہ کے ہاں مقرب تر اور نجات کا مستحق تر نہیں اور عورت ہرگز اپنی جنس کی بنا پر کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہے گی۔ عورت اپنا احساس کمتری دور کرے اور سمجھ لے کہ وہ مرد سے فروتر مخلوق نہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مذہبوں نے قرار دے رکھا ہے۔

ہندوؤں نے اپنے منوسمرتی کے اوراق میں اور کیتھولک کلیسا نے اپنے جلسوں اور کونسلوں میں صدیوں تک جو فیصلے عورتوں کی پستی اور پست فطرتی کے کئے ہیں آیت ان سب کی تردید کرتی رہی ہے، اور آگے ہے۔

وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (آیت ۳۲)

اللہ سے اس کے فضل کی طلب کرو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

چنانچہ اس نے اپنے علم کامل کے مطابق ہر مخلوق کو صلاحیت اور استعداد بخشی اور

وہی ہر ایک کی فردِ عمل پر پوری طرح مطلع بھی ہے، تو اس کا فضل توفیق اعمال میں بے شک طلب کرتے رہو۔ رشک و تمنا والی اور دعاؤں میں طلب کرنے والی چیز وہ وہبی و طبعی خصوصیتیں نہیں، بلکہ یہ نعمت توفیق حُسنِ عمل ہے۔

اور ایک آیت کے بعد آگے ارشاد ہوتا ہے :۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (آیت ۳۴)

مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں، اس لئے کہ اللہ نے انھیں ایک دوسرے پر بڑائی دی ہے، اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ روحانیات کی دنیا میں قربِ حق و حسنِ عمل کے معاملہ میں مرد و عورت کی حیثیت مساوی ہے۔ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ اور حج اور بہت سی عبادتیں جس طرح مردوں کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ مرد و زن کی یہ مساوات و یکسانی دنیوی معاملات میں انتظامی حیثیت سے قائم نہیں۔ دونوں بہ حیثیت عبد بالکل ایک ہیں۔ اعمال کی قبولیت کے باب میں عند اللہ بالکل ایک ہیں لیکن دنیا میں شریعت کا حکم ہے کہ باپ افسر ہو کر رہے، اور بیٹا ماتحت ہو کر، وہ حکم دے اور یہ حکم مانے، اب بتایا جارہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و تفوق حاصل ہے۔ "قَوَّام" کے معنی ہیں کسی شے کے محافظ منتظم، سربراہ ہونے کے، مراد یہ ہے کہ عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے، اور احکام کے نافذ کرنے والے ہیں۔

بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ان عبارتوں سے کیجئے جو ابھی پڑھ کر سنا رہا ہوں :۔

"خداوند خدا نے ...... عورت سے کہا اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا

اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا" (پیدائش باب ۳، آیت ۱۶)

یہ عبارت عہد عتیق کی تھی یعنی توریت کی، اب جدید یعنی انجیل کی بھی سنیئے:۔

"اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسی خداوند کی، کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے، جیسے مسیح کلیسا کا سر ہے، اور وہ خود بدن کا بچانے والا ہے، لیکن جیسے کلیسا مسیح کا تابع ہے، ایسے ہی بیویاں ہر بات میں اپنے شوہروں کی تابع ہوں" (افسیون باب ۵، آیات ۲۳-۲۴)

قرآن حق کا کلام ہے اور ہمیشہ حق ہی کہتا ہے، وہ کلیسا کی کونسلوں اور منوسمرتی کی طرح عورت کی تحقیر و تذلیل کا ہرگز قائل نہیں، لیکن ساتھ ہی جاہلیت قدیم اور جاہلیت جدید سے بھی ہمدردی نہیں۔ وہ عورت کو ٹھیک وہی مقام دیتا ہے جو فاطر کائنات نے اسے نظام کائنات میں دے رکھا ہے۔ بہ حیثیت ایک عبد اور مکلف انسان کے وہ مرد کے مساوی اور ہم سطح ہے لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے ماتحت و تابع ہے۔

آخر میں بہ طور اسباب قرآن نے دو باتیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ مرد کو عورت پر فوقیت طبعی و تکوینی پہلو سے حاصل ہے۔

بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ، اور مرد کی یہ افضلیت اس کے قوائے جسمانی کی مضبوطی اور دل و دماغ کی برتری کے باعث ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مرد جو عورت کا مہر اور نفقہ کے سلسلے میں خرچ کرتا رہتا ہے۔

بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ، یعنی مرد کو افضلیت دہری حاصل ہے۔ ایک تو طبعی یعنی جسمانی و دماغی قوی میں خلقی برتری کے باعث دوسرے قانونی یا معاشرتی۔ یعنی عورت خرچ میں مرد کی دست نگر رہتی ہے۔ یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ قرآنی نظام میں کمانا یا کسب معاش کرنا یا بیوی کے خرچ کا بار اٹھانا مرد کے ذمہ ہے۔ قرآن اس

نظام معیشت کو پسند نہیں کرتا، جس میں کما کر لانے کی راہیں میاں بیوی دونوں کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہوں۔

۴۱

اس سیاق میں قرآن نے اسے بھی کھول کر بیان کر دیا ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ میں کس قسم کی بیویاں خاتونیں چاہتا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (آیت ۳۴)

سو نیک بیویاں اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں اور پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں اللہ کی عنایت سے،

سب سے شروع میں جو حرف ف آیا ہے یا بے معنی نہیں۔ ف کے معنی ہیں "نتیجۃً" یعنی اور اوپر کے مقدمات سے یہ نتیجہ لازم آجاتا ہے کہ وہ نیک بیویاں ایسی ہوں کہ کیسی ہوں؟ پہلی بات یہ کہ وہ اللہ کی فرمانبردار اور عبادت گزار تو ہوتی ہیں شوہروں کی بھی فرمانبردار و اطاعت گزار ہوں۔ مساوات کے نعرے لگانے والیاں نہ ہوں۔ اور دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ شوہروں کی غیبت میں ان کی عزت و ناموس کی اور ان کے مال و اولاد کی حفاظت کرنے والیاں ہوں۔

یہ حال تو ہوا، شریف، شائستہ، مہذب بیویوں کا، جیسا کہ ہونا چاہیے۔ اب ہیں ناشائستہ اور رذیل فطرت والیاں تو ان کی بھی جھلک دیکھ لیجئے:

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ

اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم ان کی سرکشی کا علم رکھتے ہو تم انہیں نصیحت کرو، اور انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور انہیں مارو۔

یہاں آیت میں جو لفظ خوف آیا ہے (تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ) تو یہاں اس سے مراد محض شبہ یا گمان نہیں بلکہ یہ ہے کہ جب ان کی بغاوت و نافرمانی تجربہ میں آجائے ابن عباسؓ صحابی کی تفسیر خوف بمعنی علم آیا ہے۔ تخافون ای تعلمون اور دوسرے اہلِ تفسیر بھی اسی طرف گئے ہیں کہ محض بدگمانی کافی نہیں، بلکہ واقعی تجربہ قصور کا ہولے۔ اور نشوز کے معنی یہ ہیں کہ بیوی شوہر کی نافرمانی پر کمربستہ ہوجائے۔ جب پُرمسرت ازدواجی زندگی کا گھر بغاوت و تصادم کا تماشا گاہ بن جائے، تو اس وقت کے لئے پہلا حکم ہے کہ عِظُوْهُنَّ انھیں سمجھاؤ، وعظ و پند سے کام لو، عورت اگر شریف طینت ہے تو یقین ہے کہ اس نرمی و آشتی کے طریقے سے صلاح پر آجائے گی، اور اس ضمن میں یہ ہدایت بھی مل گئی کہ غصہ میں آکر کوئی فوری کارروائی نہ کر بیٹھو۔ لیکن جب یہ تدبیر کارگر نہ ہو تو اب عملی قدم یہ اُٹھاؤ کہ ترک ہم بستری کرو۔ بلکہ ھجر کے معنی یہاں ابن عباس صحابی اور متعدد تابعین سے ہجر الکلام منقول ہیں۔ یعنی ترک کلام۔ ان سے بولنا چھوڑ دو، اور جب سزا کا یہ دوسرا درجہ بھی ناکام رہے، تو انھیں جسمانی آزار پہنچا سکتے ہو۔ یہ آخری تدبیر صرف آخری درجہ میں ہے۔ جب پہلے دونوں علاج تجربہ کے بعد ناکام ثابت ہولیں۔ اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکے قسم کی ہو جس سے نہ چوٹ زیادہ آئے اور نہ اس سے رفیقِ زندگی کی توہین لازم آئے۔

بلکہ مفسر صحابی ابن عباسؓ کی تو رائے ہے کہ یہ مار مسواک کی سی ہلکی پھلکی چیز سے ہو۔ قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار یاد کر لینے کی ضرورت ہے۔) کسی ایک طبقہ سے، کسی ایک بلندئ ترقی پر پہنچی ہوئی قوم سے نہیں، اس کے مخاطب ایک ہی وقت عرب و عجم بھی، اور حبشی و مصری بھی، ہندی و چینی بھی، امریکی و افریقی بھی، بڑے سے بڑے شریف بھی اور انتہائی رذیل بھی، چمار اور چوہڑے بھی، عالم و فہیم بھی، جاہل و کودن بھی، ہر طبقہ، ہر ذہنیت، ہر اخلاقی و عقلی سطح کے لوگ

پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک، ہر زمانہ اور ہر سطح تمدن والے ہیں، اور اس لئے اس کے احکام میں احاطہ ہر انسانی اور ہر بشری ضرورت کا کر لیا گیا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ایسے طبقے اور معاشرے موجود ہیں جہاں عورت کے لئے گالی گلوج اور جسمانی سزائیں عام ہیں۔ مار پیٹ کوئی نادر الوقوع واقعہ نہیں، پھر انھیں بھی اس کی اجازت ضرورت پڑنے ہی پر ہے۔ فقہائے اُمت نے صاف کہہ دیا ہے کہ نرم تدابیر اگر کام دے جائے تو سخت صورت کی اجازت نہیں۔ اور قرآن مجید کا سیاق بھی نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے۔ یورپ میں جہاں میاں بیوی کی مار پیٹ کا رواج ہے۔ اس کا ذکر خاکسار کی انگریزی تفسیر میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں اس اجازت کا موجود ہونا ہرگز اس کے حق میں مضر نہیں بلکہ یہ تو عین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ، ہر مزاج، ہر سطح انسانی کے لئے تھے اور ہیں۔

۴۲

مصلوبیت مسیحؑ کی بحث قرآن مجید کی اہم بحثوں میں ہے۔ اور مسیحیت کے عقیدہ و اختلاف نے اسے اہم تر بنا دیا ہے۔ اس کے سمجھنے اور گتھی کے پوری طرح سلجھنے میں ذرا وقت لگے گا۔ لیکن یہ وقت ان شاء اللہ ضائع نہیں ہو گا۔ بس ذرا صبر و توجہ سے سماعت فرمائیں۔

قرآن مجید نے اسے کسی مستقل عنوان کے ماتحت نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی ایک لمبی فہرست جرائم میں محض ضمناً بیان کر رہا ہے۔ اور پورا مضمون ایک آیت میں نہیں، دو تین آیتوں میں آیا ہے۔ سورۃ النساء کا بائیسواں رکوع کھول کر ملاحظہ کیجیے، دو لمبی آیتوں میں قوم اسرائیل کی تاریخی نافرمانیوں اور مسلسل سنگین جرموں کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (آیت ۱۵۵)

سو ہم نے انھیں سزا میں مبتلا کیا، بہ سبب ان کی عہد شکنی کے، اور بہ سبب آیات الٰہی سے ان کے کفر کے، اور بہ سبب ان کے خون ناحق انبیاء کے اور بہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (نہیں) بلکہ ہے یہ کہ اللہ نے ان پر مہر لگا دی ہے، یہ بہ سبب ان کے کفر کے، سو وہ ایمان نہیں لائے مگر بہت تھوڑا سا۔

اور وہ تھوڑا سا ایمان، ناقص، نامکمل، لغوی معنی میں جو ہے، وہ مرتبہ ایمان شرعی کے لئے کافی نہیں۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ (آیت ۱۵۶)

اور بہ سبب ان کے کفر کے اور بہ سبب ان کے قول کے مریم پر بہتان عظیم کے۔

یعنی اور سب تو ان کی نافرمانیاں چل رہی تھیں، اب اس میں اضافہ انھوں نے یوں کیا کہ اس پاک سرشت مریم بنت عمران پر ایک سخت گندہ الزام لگا دیا، قرآن مجید نے اس گندہ الزام کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا، باقی یہود کی کتابوں میں تو اس شرمناک جرم کی صراحت آج تک لکھی چلی آ رہی ہے۔ یہود کی لکھی جو قدیم ترین حیات مسیح ACCORDING کے نام سے عبرانی میں موجود ہے، اس کا انگریزی ترجمہ TO HEBREWS کے نام سے چھپ چکا ہے، اس میں اس رومی سپاہی کا نام تک دیا ہے، جس کے ساتھ نعوذ باللہ آپ کو متہم کیا ہے اور یہ نام بیسویں صدی کی ایک کتاب جوزف کلازنر [illegible] کی LIFE OF JESUS تک میں نقل ہوا ہے۔

والدۂ مسیح پر بہتان عظیم کے بعد قرآن مجید کہتا ہے ان کی مسلسل سزایابی کے لئے کہ

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ج (آیت ۱۵۷)

اور بہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہم نے عیسٰی ابن مریم کو مار ڈالا جو اللہ کے پیمبر تھے۔

اس وقت یہود اس کو اپنی ہی جانب منسوب کرتے تھے، اور اس کو اپنا ایک پُر فخر کارنامہ سمجھتے تھے۔ حکومت اس وقت ملک پر گو یہود کی نہیں، رومیوں کی تھی/ فوجداری عدالتیں بھی انھیں کی تھیں، سزا دینے اور سولی پر چڑھانے کا اختیار بھی یہود کو نہیں، انھیں کو تھا، یہود تو عام رعایا کی طرح تھے۔ لیکن قرآن مجید نے یہ قول منسوب انھیں کی جانب کیا۔ مقدمہ عدالت میں یہود ہی لائے۔ گواہ استغاثہ کی طرف سے یہود ہی پیش ہوئے، اور آپ کو سزا دلوانے میں پوری سعی یہود ہی نے کر ڈالی، بلکہ جب سزا دینے میں رومی حاکم عدالت پیلاطس [illegible] مذبذب ہونے لگا تو شور و شر اس کے خلاف برپا کر کے اسے سزائے موت سنانے پر مجبور کر دیا/

انجیل متی میں ہے:

"جب پلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ اُلٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں اس راست باز کے خون سے بَری ہوں، تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اولاد کی گردن پر، اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا۔ اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تا کہ صلیب دی جائے۔" (باب ۲۷، آیات ۲۴ - ۲۶)

اس سے ملتے جلتے بیان انجیل مرقس وغیرہ کے ہیں، اور انجیل لوقا میں تو یہ تصریح بھی موجود ہے کہ:۔

"مگر پلاطس نے یسوع کو چھوڑنے کے ارادے سے پھر ان سے کہا، لیکن

وہ چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دے، صلیب! اس نے تیسری بار ان سے کہا، کیوں؟ اس نے کیا برائی کی، میں نے قتل کی کوئی وجہ نہیں پائی اور میں اسے پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ مگر وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے، ان کا چلانا کارگر ہوا۔ پلاطس نے حکم دیا کہ ان کی مرضی کے موافق ہو ...... یسوع کو ان کی مرضی کے موافق سپاہیوں کے حوالہ کیا۔" (باب ۲۲، آیات ۲۱ تا ۲۵)

اور انھیں یہود سرداروں اور عالموں ہی نے تو مسیح کو عدالت تک پہنچایا تھا۔

انجیل مرقس میں ہے:۔

"اور فی الفور صبح ہوتے ہی سردار کاہنوں نے بزرگوں اور فقیہوں اور سارے عدالت والوں سمیت صلاح کر کے یسوع کو بندھوایا اور لے جا کر پلاطس کے حوالہ کیا"۔ (باب ۱۵، آیت ۱)

اور خود انجیلوں میں جو پیش خبریاں حضرت مسیح کی زبان سے اپنے قتل یا شہادت کی بابت ہیں، ان میں بھی سبقت اور پیش قدمی یہودی کے سرداروں کی دکھائی ہے، رومی یا رومی حکومت کا نام بھی نہیں لیا ہے۔

انجیل متی میں ہے:

"اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ میں یروشلم کو جاؤں، اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں" (باب ۱۶، آیت ۲۱)۔

اور انجیل مرقس میں ہے:۔

"پھر وہ انھیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار اور فقیہ اسے رد کریں اور اسے قتل کیا جائے" (باب ۸ آیت ۳۲)

اور انجیل لوقا میں ہے:۔

> "ضرور ہے کہ ابن آدم دُکھ اٹھائے، بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے"۔ (باب ۹۔ آیت ۲۳)

تو درحقیقت یہ قرآن کی انتہائی حقیقت سنجی کا ثبوت ہے کہ اگرچہ مقدمہ پیش ہوا رومی عدالت میں اور رومی ہی عدالت نے آپ کو سزائے موت کا حکم سُنایا، لیکن قرآن مجید نے مجرموں میں صرف یہود کا لیا کہ حقیقت میں ان ہی کا ہاتھ قدم قدم پر کام کر رہا تھا۔/ یہود کا فخریہ قول کہ " ہاں ہم ہی نے عیسٰی بن مریم کا کام تمام کر ڈالا" ابھی ابھی نقل ہوا ہے ب دیکھیئے قرآن ان کے اس قول پر کیا تبصرہ کرتا ہے؛

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ

"حالانکہ وہ نہ آپ کو مار ڈال سکے، نہ آپ کو سولی پر چڑھا سکے، بلکہ ان پر شُبہ ڈال دیا گیا"۔ /

یعنی آپ کا کام تمام کر ڈالنا تو الگ رہا (وَمَا قَتَلُوْهُ) وہ تو آپ کو سولی پر بھی چڑھا نہ پائے۔ (وَمَا صَلَبُوْهُ) اور اس آخری فقرہ کے اگر یہ معنی لیئے جائیں کہ "آپ کو سولی پر نہ مار سکے" تو آپ کی ہلاکت کی نفی سرے سے پہلے ہی فقرہ میں کر دی ہے تو یہ دوسرا فقرہ صلیب پر مار نہ سکے بالکل بے کار یا حشو ہوا جاتا ہے یعنی جب آپ کسی کو کسی طرح نہ مار سکے تو اس میں سولی دینا بھی شامل ہو گیا۔ پھر اب اس کے دُہرانے کی کیا ضرورت تھی، اور قرآن مجید حشو سے بالکل پاک ہے۔ صَلَبُوْهُ کا اصل مفہوم محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کا ہے۔ چڑھا کر ختم کر دینے کا نہیں۔ امام لغت راغب کے مفردات میں ہے تعليق الانسان للقتل انسان کو ہلاکت کے لئے لٹکا دینا اُردو میں یہ مفہوم "سولی دینے" سے نہیں "سولی پر چڑھانے" ہی سے ادا ہوتا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور حضرت تھانویؒ کے اردو ترجموں میں اس کی رعایت موجود ہے۔

حضرت مسیح کے ملک اور زمانے میں سرکاری سزائے موت کے لئے طریقہ ہی صلیب پر چڑھانے کا نافذ تھا۔ تو قرآن کہتا ہے کہ یہود آپ کو ہلاک تو کیا کرتے، سولی پر چڑھانے پر بھی قادر نہ ہو سکے۔ بلکہ دھوکے میں پڑ گئے۔ اور حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ یہ شبہ میں کیوں پڑ گئے؟ یا حقیقت کس پر مشتبہ و مختلط ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ وہی یہود یا بنی اسرائیل مراد ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ مدارک میں ہے وقع علیہم الشبہ اور بیضاوی میں ہے التبس علیہم الامر۔ یا یوں کہا جائے کہ شبہ انھیں مقتول سے متعلق ہوا یا اس کی شخصیت کے بارے میں وہ دھوکے میں پڑ گئے۔ جلالین میں ہے شبه لهم المقتول والمصلوب۔

قرآن نے اس اشتباہ یا التباس کو خوب ہی مؤکد کیا ہے، اور نفی ہلاکت کو ایک بار پھر صراحت سے دہرایا ہے:

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۙ (آیت ۱۵۷)

اور جو لوگ آپ کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں اور آپ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس کوئی علم (صحیح تو ہے نہیں۔ ہاں بس یہ گمان کی پیروی ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپ کو ہلاک نہیں کیا۔

غرض اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ دھوکا یہود کو ہوا اور وہ حضرت مسیح کے بجائے کسی اور کو سولی پر دیے گئے۔ یہ شخص کون تھا؟ اور اس دھوکے کی کیا صورت ہوئی، اور ایک بڑے مجمع کے سامنے یہ دھوکا ممکن کیونکر ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے، نہ حدیث صحیح میں۔ سادہ دل مسلمان کو تو محض اس صورت حال پر جو کہ یہاں بیان ہوئی ہے، ایمان لے آنا کافی ہے اور چون و چرا میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن آج کے طالب علم کو جو فکر کیسے اور کیونکر کی پیدا ہوتی ہے،

اس کی تسکین کے لئے لازمی ہے کہ اس تاریخی گرید کا جواب تاریخ ہی کی روشنی میں دیا جائے۔ واقعہ کے ایک ایک جزئیہ کو سامنے لے آیا جائے۔ اور جو صورت واقعہ نسبتہ زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال ہو۔ اس کو اللہ کا نام لے کر ترجیحی طور پر اختیار کر لیا جائے۔ کڑی کا سلسلہ کڑی سے اُلجھنے نہ پائے۔ اس کے لئے کچھ دیر کے صبر و سکوت کی درخواست ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو اس سلسلے میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے۔ آپ کی کم آمیزی کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کے وقت اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا گروہ شناخت کے لئے کافی ثابت نہ ہوا، بلکہ آپ کی شناخت کے لئے آپ ہی کی مختصر پارٹی سے ایک غدار کو توڑ لینا پڑا۔ یہ حقیقت ہے تو خالص تاریخی، لیکن کرامت دیکھیے کہ آپ کے امام المفسرین امام رازیؒ (جن کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کے شروع کا ہے) اس راز سے واقف نکلے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> والناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم لانه
> کان قلیل المخالطة بالناس (کبیر)

لوگ حضرت عیسیٰ کو تو بس نام ہی سے جانتے تھے۔ ان کی کم آمیزی کی بنا پر۔

متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لئے انھیں یہودا منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو:

"یسوع نے ان سے پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو تو وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں" (باب ۱۸، آیات ۳ تا ۸)

حضرت مسیح کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے، معاصر مخالفین و معاندین کے نزدیک تو آپ کی حیثیت بس ایک بدنام و غیر متعارف مجرم کی تھی، وہ سامنے موجود تھا، اور اپنے کو چھپا بھی نہیں رہا تھا۔ ظاہر کر رہا تھا۔ اس پر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

(۲) دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ بطور خرق عادت یا بطور کمال فن حضرت کو تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں اس خصوصیت کو بطور معجزہ بیان کیا گیا ہے۔ انجیل متی میں ہے:۔

> "چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا۔ اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کے مانند چمکا" (باب ۱۷، آیت ۱-۲)

اور انجیل لوقا میں ہے:۔

> "جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرے کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی" (باب ۹، آیت ۲۹

(۳) تیسرے اس حقیقت کا بھی استحضار کر لیا جائے کہ ملک فلسطین کی آبادی، اس وقت اسرائیلیوں (یہود) کی تھی۔ عام رعایا یہی لوگ تھے۔ لیکن ملک کی حکومت رومیوں کی تھی۔ اور عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی، اور رومی نہ صرف مذہباً مشرک تھے، عقیدے میں اسرائیلیوں سے مختلف، بلکہ شکل و شمائل، قیافہ اور چہرہ مہرہ، وضع و لباس، زبان و معاشرت ہر چیز میں یہود سے ایسے ہی مختلف تھے جیسے ابھی کل تک انگریز ہندوستان میں رہنے کے باوجود، ہندوستانیوں سے تھے۔ اور جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے یکساں معلوم ہوتے تھے، اور جس طرح گوروں کو سارے کالے ایک سے نظر آتے تھے، اسی طرح سب بدیسی رومیوں کو کل اسرائیلی ایک ہی سے

دکھائی دیتے تھے۔

(۴) اب چوتھی کڑی اس سلسلے میں یہ ملائیے کہ جس مقام پر عدالت تھی وہاں سے سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی کے بڑے حرف T یا ریل کے سگنل سے مشابہ ہوتی تھی۔ یہ پوری اس سولی گھر میں گڑی نہیں ہوتی تھی۔ صرف اسکی سیدھی لمبی کھڑی بلّی سولی گھر میں گڑی رہتی تھی۔ اور جو لکڑی اس کے اوپر عرض میں آڑی پڑتی تھی۔ وہ وہاں نہیں، بلکہ عدالت میں رکھی رہتی تھی۔ اور دستور یہ تھا کہ اسے خونی مجرم اپنی پیٹھ پر لاد کر سولی گھر تک لاتا تھا۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا، اسے پوری طرح ذہن میں رکھ کر صورت واقعہ نظر کے سامنے لائیے۔ اور آگے پڑھیئے۔

وہ دن جمعہ کا تھا (GOOD FRIDAY کا تہوار آج تک اس کی یادگار میں منایا جاتا چلا آرہا ہے) حکم جب سُنایا گیا تو دن آخر ہو رہا تھا۔ یہود کو جلدی تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے ہر طرح فراغت پا کر اور مجرم کو دفن کر کے شاموں شام گھر واپس پہونچ جائیں۔ ان کا یوم السبت جمعہ کی شام ہی سے شروع ہو جاتا تھا اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی و تدفین وغیرہ بھی ممنوع تھی۔ اور پھر یہود کا اہم تر تہوار عید فسح (Passover) بھی شروع ہونے کو تھا۔ غرضکہ یہود کو اس کی بڑی عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

ناتوان ولاغر مجرم (حضرت مسیحؑ) کے لئے ممکن نہ تھا کہ پشت پر اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی پیچھے اور خود یہود انھیں قدم قدم پر چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے۔ انجیل متی و مرقس دونوں میں ہے کہ راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر ان پر لعن وطعن کرتے۔ بلکہ دو ڈاکو مجرم جو ساتھ تھے وہ بھی اس میں شریک رہے۔

اس ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ نظر کے سامنے لاکر خود سوچئے کہ رومی سپاہی جو حاکم قوم کے افراد تھے اور مجرم کو اپنی حراست میں لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر کیا کیا ہوگا؟ ـــــــ خود اپنے اوپر تو وہ تنکے کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انھوں نے وہی کیا جو ایسے موقع پر کوئی ان کا سا انسان کرتا۔ انھوں نے راہ ہی میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب والی لکڑی اس پر لاد دی۔ یہ محض قرینہ و ظن و قیاس نہیں۔ انجیلوں میں اس کی تصریح ملتی ہے۔

> "انھیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے"۔
>
> (متی باب ۲۷، آیت ۳۱) /

ایک حوالہ یہ ہوا، دوسرا اور لیجئے:۔

> "اور شمعون نامی ایک کرینی آدمی، سکندر اور روفس کا باپ، دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انھوں نے اس کو پکڑ لیا کہ اسکی صلیب اٹھائے" (مرقس ۱۶: ۳۱)

تیسرا حوالہ اور ملاحظہ ہو:

> جب اس کو لئے جاتے تھے، تو انھوں نے شمعون نام ایک کرینی جو دیہات سے آتا تھا پکڑ لیا، صلیب اس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے (لوقا ۲۳: ۲۶)

اچھا، اب جب یہ عوام الناس کا ہجوم اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ خانی کرتا، اس سے تمسخر کرتا، سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا، تو رومی پولیس کا جو گارد ہمراہ تھا، اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب عمل دخل جیل کے وارڈوں، سنتریوں کا شروع ہوا۔ وہ کیا جانے کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے، خدائی یا پیمبری کا دعویدار کون ہے۔ وہ مجرم حسب دستور، اس کو سمجھے، جس کی پشت پر صلیب لدی ہوئی تھی! ایک بار پھر اس نفسیاتی حقیقت کا استحضار کر لیجیے کہ جیل کے رومی، سنتریوں کے لئے سب اسرائیلی اجنبی ہی تھے۔ اور اس لئے سب آپس میں ہم شکل، ان کے لئے ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی

(شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ بالکل قدرتی تھا۔ انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق محسوس ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا، لیکن اِدھر ہجوم کا شور و ہنگامہ، اُدھر رومی سنتریوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سولی پر چڑھا دینے کی جلدی، اس اَفراتفری کے عالم میں شمعون اسرائیلی کو مجرم سمجھ کر سولی پر چڑھا دیا گیا۔ وہ چیختا چلّاتا رہا۔ اور حضرت مسیحؑ اس ہڑبونگ میں یقیناً رہا ہوگئے، اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیں مارتے رہے۔ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ کی تفسیر اس سے بڑھ کر روشن تر اور کیا ہوگی!

آخر میں یہ بھی سُن لیجیے کہ یہ عقیدہ بالکل نو ایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم فرقہ باسلیدیہ (Basildian)۔ (بانی فرقہ کا سال وفات سنہ ۱۴۰ء) اس عقیدہ کا قائل ہوا ہے، اور کھلّم کھلّا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے!

قرآن مجید اس عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ لیکن پولوس (متوفی سنہ ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی، اس کی بنیاد ہی عقیدۂ کفارہ پر ہے۔ یعنی اس پر کہ ابن اللہ نے، یا خود خدا نے مجسّم ہوکر، اور مصلوب ہوکر جانکنی کی تکلیف اٹھاکر، اور اپنی جان دے کر ساری گنہگار مخلوق کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا۔ اس لئے رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیحؑ کے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی! اور اسی لئے لامحالہ اس پولوسی اور تمام تثلیثی مسیحیت میں کل قدیم تر اور صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو "مبتدع و بددین" قرار دے کر دائرہ مسیحیت سے القط کر دیا، اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنان مسیحؑ یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے۔ یعنی کہ عیسیٰ صلیب پر وفات پاگئے۔ گو ظاہر ہے کہ اس اشتراک عقیدہ میں نیتیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود ہلاکت مسیحؑ کو موقع تحقیر واہانت پر بیان کرتے ہیں، اور مسیحی بجنسہ اس واقعہ کو آپ کی عظمت، بلکہ

اُلوہیت پر دلیل لاتے ہیں۔ نفسِ وفات بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔

سچ کہا قرآن نے کہ مسیح کے بارے میں یہ لوگ یعنی اہلِ کتاب آپس کے اختلاف میں لپٹے ہوئے ہیں، کوئی آپ کو عرشِ اُلوہیت پر بٹھائے دیتا ہے اور آپ کی خدائی کا کلمہ پڑھ رہا ہے، کوئی مرتبۂ نبوت بلکہ ولایت و مقبولیت سے بھی نیچے اُتار لاتا ہے، اور آپ کو نعوذ باللہ شعبدہ باز قرار دے رہا ہے اور قرآن نے یہ جو آپ کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ۔ تو شَكٍّ کی بہترین تفسیر مفسّر تھانویؒ نے کی ہے: قول بلا دلیل، یہ قول بلا دلیل ہی کی برکت تو ہے کہ نظریہ پر نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں، اور کوئی بات بنائے نہیں بنتی۔ مسیحی مسیحیوں سے دست و گریبان ہیں، اور یہود یہود سے۔ دیکھتے دیکھتے، اندر ہی اندر خدا معلوم کتنے فرقے نکل آئے ہیں، ایک دوسرے کو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

”چوں نہ دیدند حقیقت، رہِ افسانہ زدند“

اسی موقع کے لئے ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ، اور علم سے مراد علم ثابت بالدلائل ہے۔ تحقیق سے تہی دستی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ نہ کوئی نص اسکی خیال آرائیوں کی پشت پر ہے، نہ کسی نص سے استنباط صحیح ـــــ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ: ظن یہاں مقابل میں علم کے ہے۔ یعنی کوئی دلیل نہ عقلی نہ نقلی ہے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا۔ مدارک سے لے کر جلالین تک سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ فقرہ نفیِ قتل و ہلاکت کی تاکید کے لئے ہے چوں کہ عقیدۂ وفاتِ مسیح یا قتلِ مسیح بہت بڑی گمراہی کا باعث ہے۔ اور دنیا کے دو بڑے مذہب مسیحیت اور یہودیت اسی غلط عقیدہ میں پڑے ہوئے ہیں، اس لئے قدرتاً قرآن کو ضرورت بھی اسکی تردید کی، اس وضاحت و تاکید کے ساتھ، پیش آئی۔

(۴۳)

قرآن مجید نے عقیدہ کے سلسلہ میں بڑا زور تسلسل وحی پر دیا ہے، یعنی اسلام دنیا کے لئے کوئی جدید یا نو پیدا مذہب نہیں ہے۔ اور نہ رسول اسلام دنیا میں پہلے شخص ہیں جن پر وحی آئی ہے، بلکہ نزولِ وحی کا سلسلہ دنیا میں بہت قدیم سے چلا آرہا ہے، اور دنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف زمانوں میں پیمبر برابر پیدا ہوتے ہی رہے ہیں، جنھوں نے اللہ کے کلام کی منادی کی ہے، اور اللہ کا کلام بندوں تک پہنچایا ہے۔ چنانچہ اسی سورہ نساء میں بڑے زور اور صفائی کے ساتھ اس مضمون کو بیان کیا ہے، اور نبیوں کے نام تک صراحت سے دے دئیے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ
مِنْ بَعْدِہٖ ۚ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰہِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ
وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَ
ہٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ (آیت ۱۶۳)

یقیناً ہم نے آپ پر (اے پیمبر) وحی بھیجی، جیسی وحی ہم نے بھیجی نوح اور اُن کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان پر بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو ایک صحیفہ دیا تھا۔

روئے سخن زیادہ تر یہود ہی کی جانب ہے اور عقلاً حجت انھیں پر قائم کی ہے کہ جب تم حضرت نوحؑ کے بعد بہت سے نبیوں کو جانتے ہو اور مانتے ہو، اور نظامِ وحی کے پوری طرح قائل ہو، تو ایک نئے نبی کی شناخت و معرفت سے تمھیں اتنی وحشت اور دشواری کیوں ہو رہی ہے؟ نبیوں کے نام لینے کے بعد ذکر ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ
نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ (آیت ۱۶۴)

اور دوسرے پیمبروں پر بھی وحی بھیجی تھی کہ ان کا حال ہم آپ سے پیشتر بیان کر چکے ہیں، اور ایسے پیمبروں پر بھی کہ، ان کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا، اور موسیٰ سے اللہ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔

اس میں اس بات کا اثبات ہے کہ ایسے پیمبر بھی ہوئے ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے۔ اور یہیں سے یہ مسئلہ ہمارے متکلمین نے اخذ کیا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ نام بہ نام ایمان لانا ضروری نہیں، بلکہ سب نبیوں کی اجمالی تصدیق ضروری ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس انداز کے ساتھ آیا ہے یعنی فعل، کے بعد پھر اسی مصدر کو لانا، وہ بھی تنوین کے ساتھ، عربی کے اسلوب بلاغت کے مطابق، اس سے کلام کی کوئی خاص حیثیت اور خصوصیت رکھتا تھا۔ ورنہ محض کلام و مخاطبہ تو عام معنی میں ہر ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہی ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى
اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (آیت ۱۶۵)

پیمبروں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) تاکہ لوگوں کو پیمبروں (کے آنے کے) بعد اللہ کے پاس عذر باقی نہ رہ جائے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست، بڑا حکمت والا۔

ان پیمبروں کے آنے کی غرض و غایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ نیکی اور اجر و ثواب کے، اور بدی و عذاب، کے راستے لوگوں کے علم و نظر میں رکھیں، اور وحی الٰہی کی روشنی میں انھیں وہ درس دیں جہاں تک عقل و دماغ کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور پیمبروں کے آجانے کے بعد اب کسی کو قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہا کہ ہماری عقل مسائل و حقائق کے سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور متکلمین نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بندوں پر حجت، اللہ کی طرف سے

ارسالِ رُسل اور بعثت انبیاء کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرد عقل و فہم کی بنا پر۔ چنانچہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اسے تکرار کے ساتھ لکھا ہے۔

اور اخیر آیت میں جو دو خطاب الٰہی عَزِیْزٌ و حَکِیْمٌ آئے ہیں، تو یہ یاد دلانے کے لئے کہ وہ عزیز یا غالب کل تو، مالک و مختار اور فاعل حقیقی کی حیثیت سے حق اور اختیار رکھتا تھا کہ پیغمبروں کے بھیجے بغیر ہی، ہر عذر قطع کر دیتا۔ لیکن اس حکیم کی شانِ حکیمانہ نے یہ چاہا کہ وہ ظاہری عذر بھی باقی نہ رہنے دے۔

(۴۴)

یہود کے ذکر سے فارغ ہو کر ختم سورہ کے قریب ایک بار پھر، اثباتِ توحید و تردید تثلیث کے مضمون کو، زور و قوت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہود جس طرح تفریط کے مریض ہیں، عیسائی افراط کی انتہا پر پہونچ گئے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ مسیح کو بجائے ایک صالح اور مقبول برگزیدہ پیمبر کے، خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۗ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (آیت ۱۷۱)

اے اہلِ کتاب، دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کے بارے میں کوئی بات

حق کے سوا نہ کہو، مسیح عیسٰی ابن مریم اللہ کے ایک پیمبر ہی ہیں اور اس کا کلمہ جسے پہنچا دیا تھا اللہ نے مریم تک، اور ایک جان ہیں اس کی طرف سے بس اللہ اور اس کے پیمبروں پر ایمان لاؤ، اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں (اس سے) باز آجاؤ، تمھارے حق میں یہی بہتر ہے، اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے، وہ پاک ہے اس سے کہ اس کے بیٹا ہو۔ اُس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہی کا، کارساز ہونا کافی ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ (آیت ۱۷۲)

اور مسیح ہرگز اس سے عار نہ کریں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور نہ مقرب فرشتے۔ اور جو کہ اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبّر کرے گا، اللہ سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

اپنے دین میں غلو نہ کرو، یعنی افراط نہ تفریط۔ ٹھیک صراط مستقیم پر قائم رہو۔ مرشد تھانوی فرماتے تھے جس طرح یہود کا غلو، احکام ظاہری میں تعمق تھا، اور مسائل باطنی کی طرف سے اعراض اسی طرح عیسائیوں کے غلو میں، مسائل باطن میں تعمق اور ظاہر کی طرف سے اعراض۔ طریق حق، ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے۔

اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو، یعنی الوہیت کے باب میں کوئی فیصلہ اپنی رائے سے گڑھ کر نہ پیش کرو۔ اور توحید میں کوئی شائبہ بھی شرک کا نہ آنے دو۔ اور مسیح ابن مریم کی حقیقت بھی بس اسی قدر ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول تھے جیسے اور بہت سے رسول گزر چکے ہیں، نہ کہ خدا، یا مظہر خدا، یا فرزند خدا۔ اللہ کے رسولوں اور اس کے بھیجے ہوئے قاصدوں کو معبودیت یا نیم معبودیت پر پہنچا دینے کا مرض مشرک

قوموں میں کثرت سے رہا ہے۔ عیسائیوں نے بھی مصری شرک اور یونانی و رومی مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیمبر برحق کو، مظہر خدا اور فرزند خدا قرار دے دیا، رہا ان کا کَلِمَۃُ اللّٰہ ہونا، تو اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ان کی پیدائش اللہ کے ایک کلمہ ہی کا نتیجہ ہے، اور خود کلمہ سے مراد کلمۂ کُنْ ہے، جو بہ واسطہ جبرئیل علیہ السّلام حضرت مریم پر القاء ہوا۔

رُوْحٌ مِّنْهُ، یعنی اللہ کی طرف سے اللہ کی بنائی ہوئی ایک روح، جو بہ واسطہ فرشتہ جبریل، اور بلا اسباب ظاہری و مادّی، حضرت مریم کے بطن میں مجسّم ہو گئے۔ اور کلمہ اور رُوح کا انتساب اللہ کی جانب محض اس تعلق کے شرف و عظمت کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسے خانۂ کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں، حالانکہ اللہ کے گھر سب ہی ہیں۔ قرآن ہی میں ایک ترکیب نعمۃ مّن اللہ کی آئی ہے۔ حالانکہ جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے تو ہوتی ہی ہے۔

رُوْحٌ مِّنْهُ سے مراد یہ نہیں کہ اللہ کی روح صرف انھیں میں تھی، اور کسی فرد بشر میں نہیں ہوتی۔ اللہ کی روح تو ہر فرد بشر میں ہوتی ہے۔ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ قرآن مجید میں مقام تخصیص و امتیاز پر کسی کو عَبْدَهٗ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور کسی کو عبدنا سے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کے بندے سب ہی ہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ، یعنی اللہ کے پیمبروں پر ایمان لاؤ۔ پیمبروں ہی کی تعلیم کے مطابق۔ اور فَاٰمِنُوْا کی ف میں یہ اشارہ ہے کہ ان صحیح حقائق کو سمجھ لینے کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد اور خیالات کو چھوڑ کر ایمان، اللہ کے رسولوں کی صحیح ہدایات پر لاؤ۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ: تین نہ ٹھہراؤ، اللہ بس ایک ہی ہے۔ نہ تین اقنوم، نہ تین مستقل بالذات ہستیاں۔ تین کسی معنی اور کسی حیثیت سے بھی نہیں۔ تثلیث کا گورکھ دھندا جس طرح عیسائیوں

کتابوں میں درج ہے ہماری آپ کی، شاید سب ہی کی فہم سے بالاتر، وہ انھیں کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ اور اگر آپ سن چکے ہیں تو دوبارہ سننے کا لطف حاصل فرمائیے۔ سُنئے:

”باپ، بیٹے، روح القدس کی اُلوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر۔ عظمتِ ازلی یکساں۔ جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا، اور ویسا ہی روح القدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق، اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود، اور روح القدس غیر محدود۔ یوں ہی باپ ازلی، بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی“ /

تاہم تین ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود نہیں، اور نہ تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔

باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق۔ تو یہ بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق۔

ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا، روح القدس خدا۔ اس پر تین خدا نہیں، بلکہ ایک خدا“ کہاں توحید کا سادہ عام فہم کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور کہاں تثلیث کا یہ گورکھ دھندا خدا کا صحیح رشتہ بندہ کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے۔ مالک و مملوک کے درمیان مُباینت لازمی ہے۔

برخلاف اس کے والد اور مولود کے درمیان مجانست یعنی ہم جنسی و ہم نوعی شرط ہے تو جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی بھی مخلوق اس کی اولاد نہیں ہوسکتی۔

اور عقیدۂ ولدیت غلط ہی نہیں بلکہ عقلاً مہمل ہے۔ تنزیہ الوہیت کے لئے باعث توہین اور شانِ الوہیت کے لئے بالکل منافی ہے!

وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا، اس حقیقت کے اظہار سے مشرکوں پر یہ سوال قائم کردیا کہ کیا خدا کو بندوں کی حاجت روائی اور اپنی کارسازی میں کسی کی اعانت کی محتاجی ہے؟

جو وہ کسی کو شریک کرے۔

پھر اگلی آیت میں ملائکۂ مقربین کا عطف مسیح پر بہت معنی خیز ہے۔ ایک طرف ملائکۂ مقربین اور دوسری طرف حضرت مسیح۔ یہی دو تو دنیا میں کثرت سے پُجے ہیں، مشرکوں نے فرشتوں کو دیوی، دیوتاؤں کے نام دے کر شریک اُلوہیت کرلیا، اور مسیحیوں نے مسیح کو خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ اسی لئے خصوصیت کے ساتھ تصریح ان دونوں کی نفی الوہیت کی گئی۔ اور بتایا گیا کہ اللہ کی عبدیت، کوئی چیز توہین والی نہیں۔ مسیح اور ملائکۂ مقربین تو اس پر فخر کرتے ہیں، نہ یہ کہ اس سے شرمائیں، یا کسی قسم کا بھی ننگ محسوس کریں۔ مرشد تھانویؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ مراتب شرف میں عبدیت مرتبۂ اعلیٰ ہے اور بیان کو ختم اس قانون پر کیا ہے کہ اللہ کی بندگی میں کوئی عار محسوس ہی کیسے کرسکتا ہے، جب اللہ ایسا حاکم مطلق ہے، کہ کیا فرشتے اور کیا پیمبر سب ہی کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ہی ہے۔

(۴۵)

سورۂ مائدہ کے چھٹے رکوع کے آخر میں تاکید ہے کہ تقویٰ الٰہی اختیار کرو، اور اس پر اعتماد و توکل اختیار کرو۔ اس کے معاً بعد بنی اسرائیل کا ذکر آتا ہے، اور تاریخی استناد کے طور پر بیان ان کے قبیلوں کا ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ
اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ۭ (آیت ۱۶)

اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں بارہ ۱۲ سردار مقرر کئے تھے، اور ان سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

لیکن پہلے تقویٰ کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم یہاں سمجھ لیا جائے۔ قرآن مجید میں بار بار اشارے صراحتیں اس مضمون کی ملتی ہیں کہ دنیوی غلبہ و کامیابی میں بڑا دخل تقویٰ کو رہتا ہے۔

قناعت، بے طمعی، بے نفسی، جذبات پر قابو، صداقت شعاری، عدل، خودداری، غیرت مندی، حفظ حدود، غرض سیرت و کردار کی ساری ہی خوبیاں، کیا انفرادی، کیا اجتماعی، اس ایک جامع لفظ تقویٰ کے اندر آجاتی ہیں۔

اس کے بعد شہادت ایک مؤحد قوم بنی اسرائیل کی پیش ہوتی ہے کہ جب تک انھیں اطاعت و فرمانبرداری کے احکام، ان کے پیمبروں کے واسطے سے پہنچائے گئے، ان سے احکام کا عہد لیا گیا، اس وقت تک ان کا عمل بھی ان کے قول کا ساتھ دیتا گیا۔ اور جب انھوں نے عہد شکنی کرنا اپنا شیوہ بنالیا، تباہ و برباد ہوگئے۔

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا، یہ اسرائیلی سردار تعداد میں ان کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق تھے۔ ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک سردار۔ اور توریت کا بیان اس کے بالکل مطابق ہے۔ کتاب گنتی (Numbers) کے پہلے باب میں ہے کہ مصر سے اسرائیلیوں کے نکلنے کے دوسرے برس خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے فرمایا۔

> "بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا مطابق ان کے فرقوں کے اور ان کے آبائی خاندانوں کے اسم شماری کے ساتھ، ہر ایک مرد سر سے سر گن کر حساب کر، اور ہر فرقہ پر ایک ایک آدمی، ہر ایک جو اپنے خاندانوں کا سردار ہے، تمہارے ساتھ ہو"۔ (آیت ۲-۴)

آگے ان سرداروں کے درج ہیں، اور وہ تعداد میں بارہ ہیں۔ اور پھر اسی توریت میں ایک دوسری جگہ کنعان و فلسطین پر فوج کشی سے ذرا قبل کے موقع پر ہے:

> "خداوند نے موسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج، تاکہ کنعان کی زمین کی، جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں، جاسوسی کریں، ایک ایک مرد جو اس کے آبائی فرقہ میں سے، جو اس میں سردار ہے، بھیج دے۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشتِ فاران میں ان کو بھیجا۔ وہ سب لوگ بنی اسرائیل

کے سردار تھے"۔

یہاں بھی سرداروں کی تعداد بارہ ہی درج ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّي مَعَكُمْ : اس شرطِ اطاعت پر، اس جزاء معیت الٰہی کا ترتب اب کیا بتایا جائے، کہ ایک موحّد و خدا پرست قوم کے لئے کس درجہ ہمت آفریں و شوق افزا ہو سکتا ہے! دل اس کے بعد کس قوی و مطمئن ہو جاتا ہے، اور شکست کا کوئی احتمال بھی اس کے بعد ان کے سامنے نہیں آسکتا۔ آج کوئی وزیر یا گورنر، رعایا کے کسی فرد سے کہہ دے کہ گھبراؤ نہیں، ہم خود تمہارے ساتھ ہوں گے، تو اس کا دل کتنا بڑھ جائے اور کتنا حوصلہ اسے حاصل ہو جائے۔ چہ جائیکہ یہاں خالق کائنات، مالک الملک حاکم علی الاطلاق، اپنی معیت کا یقین دلا رہا ہے! تسکین و اطمینان کی کوئی منزل اس کے بعد باقی رہ جاتی ہے؟

یہ ایک پہلو تھا، اب دوسرے پہلو سے دیکھئے کہ کیا معصیت بندے کے اس استحضارِ معیت الٰہی کے بعد ممکن ہے؟

کسی بزرگ و مقبول بندہ کی نگرانی تو ہوائے نفس کو روک دیتی اور نفس پر ایک بریک لگا دیتی ہے، چہ جائیکہ ہمہ بیں، ہمہ داں، ہمہ تواں، مالک و مولٰی کی معیت کا استحضار!

غرض ترغیب و ترہیب کے جس پہلو سے بھی دیکھئے، یہ معیتِ الٰہی کا مراقبہ بہترین و مؤثر ہی ہے۔

یہ ہمارے محققین نے صاف ہی کر دیا ہے کہ معیت سے مراد معیتِ جسمانی تو ہو ہی نہیں سکتی، جیسی مخلوق مخلوق کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ یہ معیت، احاطۂ علم و قدرت و تصرف کے لحاظ سے ہے۔

(۴۶)

اور اسی سورۃ المائدہ میں جزم کے ساتھ مسیحیت اور اس کی ایک خاص شکل کی تکفیر، جزم و قطعیت کے ساتھ ہے۔ مسیحیت کی اکثر صورتیں تو کھلے ہوئے کفر و شرک کی ہیں

بعض شاخوں نے اور غلو کر کے یہ مسلک اختیار کر لیا تھا کہ مسیحؑ، خدا، یا مظہر خدا کیسے، وہ تو عین خدا ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (آیت ۱۷)

بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو عین مسیح ابن مریم ہے۔

اصل مسیحی عقیدہ جو پروٹسٹنٹ و کیتھولک، سارے مسیحی فرقوں میں مشترک ہے یہ .... اس کے اصل الفاظ اس خطبہ میں کچھ منٹ قبل آپ سن چکے ہیں، جس میں تینوں اقنوموں کی الوہیت، ازلیت، غیر مخلوقیت، قدرتِ مطلقہ، غیر معبودیت ایک بتائی گئی ہے۔ کیا کوئی شرک اس سے بڑھ کر کھلا ہوا بھی ممکن ہے؟

اب قرآن ان کے اس دعویٰ پر جرح کر رہا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (آیت ۱۷)

اچھا تو آپ کہئے، کون کچھ بھی بچا سکے ہے اللہ سے اگر وہ ہلاک کر دینا چاہے مسیح ابن مریم کو، اور ان کی والدہ کو، اور جو کوئی بھی زمین میں ہے ان سب کو۔

ساری ملکیت و مالکیت تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ارادہ میں کوئی بھی حائل و مانع ہو سکتا ہے؟ حتیٰ کہ مسیح بھی اور ان کی والدہ محترمہ بھی، باوجود اپنی صالحیت، مقبولیت اور بلندی مرتبہ کے! اور ساری دنیا میں مل کر بھی اس کی ملکیت اور مالکیت سے باہر کہیں جا سکتی ہے؟ —— تو جب صورت حال یہ ہے تو اے مسیح پرستو تم کس منہ سے مسیح اور والدۂ مسیح کے شریک الوہیت ہونے کا دعوے کر سکتے ہو؟ ——

مسیح کے ساتھ والدۂ مسیح کا نام یہاں لے آنے کا کھلا ہوا راز یہ ہے کہ مسیحیوں کی ایک بڑی آبادی، کروڑوں کی تعداد میں حضرت بی بی مریم کو بھی خدائی میں حصہ دار یقین کر رہی ہے۔ یہ عقیدہ، عقل اگر بالکل ہی ماری نہیں گئی ہے، تو بجز شرک صریح کے اور کیا ہے؟ اور

اسی عقیدۂ مریم پرستی کے لئے اگر حوالوں کی تلاش ہو تو اس خاکسار کی انگریزی تفسیر کے مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائیے۔

اور آگے سُنئے!:

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (آیت ۲۰)

اور اللہ ہی کی حکومت ہے، آسمانوں اور زمین پر، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

یعنی ساری موجودات پر اور ساری کائنات پر حکومت تو اکیلے اسی کی ہے، بلا کسی کی شرکت و اعانت کے۔ اور بے اختیاری، بے بسی، اور عجز محض میں، جیسے کل دنیا ویسے ہی حضرت مسیح اور ان کی والدہ بھی۔ اس اعتبار سے اس میں ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ انہیں خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیتے ہو!

آیت کا آخری ٹکڑا معنویت سے لبریز ہے۔ اللہ جو چاہے، اور جس طرح چاہے پیدا کر دے۔ مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی پیدائش چونکہ بن باپ کے ہوئی ہے، اس لئے انہیں عام بشر یا محض انسان کیسے تسلیم کیا جائے۔ وہ یقیناً مافوق البشر تھے اور الوہیت میں حصہ دار۔ جواب اسی کا ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ تو ہر چیز کی تخلیق پر قادر ہے، چاہے بھی جس طرح ہو، سُنتِ عادی و عمومی کے مطابق بھی اور اس کے مخالف بھی۔ اس کی قوتِ خلاقی کسی صورت و طریق کے ساتھ مقیّد و محدود نہیں، اور وہ تخلیق کی ہر نوع اور ہر صنف پر قادر، بلا واسطہ ہو یا بہ واسطہ، سب اسکی قدرت کے آگے ہیچ۔ اور وہ سب پر یکساں قادر۔ تو اس بنیاد کو بھلا کیا پیش کرتے ہو؟

۴۷

ایک بڑی معرکہ کی بحث یہ ہے کہ جس طرح ہمارے دیس میں متعدد خاندان ایسے ملیں،

جو اپنے کو دیوتا زادے سمجھتے ہیں، اور کوئی چندر بنسی کہلاتے ہیں، یعنی چاند زادے، اور کوئی سورج بنسی، یعنی سورج زادے۔ اسی طرح اہل کتاب انبیازادوں کا فخر اپنی عالی نسبی کی حدود سے تجاوز کرکے خدازادے ہونے تک پہنچ رہا تھا۔ اب قرآن میں اسی مقدمہ کی رُوداد ملاحظہ ہو:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (آیت ۲۱)

یہود اور نصرانی کہتے ہیں کہ ہم خدا کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں۔

اور اپنے اس قول سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اس لئے ہم اور انسانوں سے کہیں اشرف افضل بھی ہیں

نَحْنُ، صیغۂ جمع متکلم سے مراد افراد ملت نہیں، بلکہ قوم یا ملت تھے یعنی من حیث القوم اور نصرانی بہ اعتبار ملت۔

موجودہ بائبل میں ان کے فخریے آج تک لکھے چلے آرہے ہیں:

”خداوند نے یوں فرمایا کہ اسرائیل میرا بیٹا، بلکہ پلوٹھا ہے“ (کتاب خروج باب ۴، آیت ۲۲)

”تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو“ (کتاب استثناء، باب ۱۴، آیت ۱)

یہ حوالے توریت کے تھے، اور جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۶، صفحہ ۹۵ پر انھیں عقائد کی تکرار کی موجود ہے۔ رہی انجیل، تو اُس میں بھی اسی طرح کی عبارتیں آج تک لکھی چلی آرہی ہیں:

”جتنوں نے اسے قبول کیا تو اُس نے انھیں خدا کا فرزند ہونے کا شرف بخشا“ (یوحنا باب ۱ آیت ۱۲)

اَبْنَآء (جمع ابن کی) سے مراد حقیقی صلبی بیٹے نہیں۔ اس کے لئے عربی میں دوسرا لفظ ہے۔ وَلَد۔ ابن کا اطلاق مجازی منہ بولے لڑکوں پر پوری طرح ہوتا ہے، اور عربی میں اس کا یہ مجازی استعمال کثرت سے اور بہت عام ہے، امام لغت راغب اصفہانی نے اس کی بہت سی مثالیں اپنے لغت میں جمع کردی ہیں۔ ابن السبیل، ابن اللیل، ابن العلم، ابن الیوم وغیرہا۔ اور دوسرے اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب اور ابن اور بنت

یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے وہ کسی کی جانب منسوب ہوکر استعمال ہوتے ہیں، اور ایسے ناموں کی ایک پوری فہرست دے دی ہے جو عربی میں بعض اسماء معرفہ و نکرہ کے لئے چلے ہوئے ہیں۔ مثلاً ابن الطین، یعنی حضرت آدم، ابن اللیل یعنی چور، ابن الاقوال یعنی باتونی شخص وغیرہ۔

ہمارے مفسرین نے (اللہ ان پر رحمت کرے) بلا اس کے کہ بائبل کے محاوروں کا کوئی خصوصی مطالعہ کیا ہو، محض اپنے اشراق ایمانی سے یہی معنی قرار دیے ہیں۔ تفسیر کبیر و مدارک وغیرہ میں انھیں نقل بھی کیا ہے کہ ہم خاصان خدا ہیں، خاصان خدا کی اولاد ہیں، اس لئے خود بھی خاصانِ خدا ہی شامل ہیں، اور ہمارا اور عام خلقت کا مقابلہ ہی کیا۔ حاصل انکی تقریروں کا یہی تھا کہ ہم خاصانِ خدا اور مقربین حق میں ہیں۔ وہی ذہنیت جو آج مسلمانوں میں بھی کتنے پیرزادوں، بزرگ زادوں، مخدوم زادوں کی ہے۔ قرآن اس عقیدہ پر زد لگاتا ہے:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ
خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ (مائدہ، ع ، آیت ۲۲)

آپ کہہ دیجیئے کہ تو پھر خدا تمھیں گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں، بلکہ تم (محض بشر ہو، اس کی مخلوقات میں سے۔ وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔

یعنی بلا کسی استثناء و امتیاز کے۔ اس کا قانون جزا و سزا تو عام ہے، اور وہی تمھارے لئے بھی ہے

اور وہی حاکم برحق اور قادر مطلق یہ وعدہ کرچکا ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے مغفرت ہے اور اہلِ کفر کے لئے دائمی عذاب۔ بداعمالی پر سزا تو ایک مشاہدتی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہ تھی۔ اور دنیوی سزاؤں کے تذکرہ سے تو عہد عتیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ انھیں کی طرف یہود اور نصرانیوں کو توجہ دلائی ہے کہ قانون مجازات و مکافات بھلا

کسی کی مُرو رعایت کرتا ہے۔ عذاب سے بچنے پر تمہارا اپنی بزرگ زادگی پر تکیہ رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟

نمبر ۴۸

بنی اسرائیل کی تاریخ اور یہود کے اعمال و عقائد کا بیان قرآن مجید کے خصوصی موضوعوں میں سے ہے اور بار بار آیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں ایک جگہ ذرا نئے انداز میں ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آیت ۲۱)

اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اللہ کا وہ احسان تم اپنے اوپر یاد کرو، جب اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے اور تمہیں خود مختار بنایا، اور تمہیں وہ دیا جو کسی قوم کو بھی نہیں دیا گیا تھا۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اللہ کے دُہرے احسان یاد دلا رہے ہیں۔ ایک یہ کہ پیمبر انھیں کی قوم کے درمیان اُٹھتے رہے ہیں۔ فِیْکُمْ یہاں مِنْکُمْ کے معنی میں ہے۔ یعنی تمہاری قوم کے درمیان نعمتِ نبوت رکھ دی، اور نبوت چونکہ ایک مرتبۂ شخصی و انفرادی ہوتا ہے اس لئے قرآنی بلاغت نے یہاں قید "تمہارے درمیان" کی لگا دی۔ اور دوسری نعمت بادشاہت ملوکیت یا مِلکیت کی ہے۔ چونکہ یہ قومی و اجتماعی ہے، اس لئے بلا کسی قید یا تخصیص کے اسے بلا کسی مِنْکُمْ یا فِیْکُمْ کے، یہاں محض جَعَلَکُمْ کہہ دیا۔

اس نکتہ پر نظر، قرآن کے ہر طالب علم کی، خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں، اور وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ضرور پڑنا چاہیئے، اور عبارت کی اس دقیقہ رسی کی پوری قدر کرنا چاہیئے۔ مُلُوْکًا کا ترجمہ اس میں آپ کو خود مختار سنایا جا رہا ہے۔ عربی میں مَلِكٌ کا مفہوم

بڑا وسیع ہے، محض بادشاہ یا تاجدار تک محدود نہیں۔ ہر آزاد، خود مختار، صاحبِ حیثیت شخص پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لغت و تفسیر دونوں میں اسے صاف کر دیا گیا ہے۔ اور حدیث میں ایسے شخص پر مَلِك کا اطلاق آیا ہے، جو اپنا ذاتی مکان اور خادم رکھتا ہو، تفسیر ابن جریر طبری میں ہے[۱]

عن زید بن اسلم قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم
من کان له بیت وخادم فهو مَلِكٌ ـــ

اور تفسیر قرطبی میں اسی کے مثل روایت نقل ہوئی ہے اور خود قرآن مجید کی سورۃ البقرۃ رکوع ۳۰ میں مَلِك سردارِ فوج کے معنی میں آیا ہے۔ اِبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلُ۔ بلکہ جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد، ص ۵۰۰ سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ فلسطین کے محاورہ میں تقریباً ہر سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا۔[۱]

حضرت موسیٰ کی یہ تقریر ہے اس زمانہ کی، جب بنی اسرائیل مصر کی غلامی سے آزاد ہو کر جزیرہ نمائے سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ایک ہی وقت میں دینی رہبر و پیمبر بھی تھے اور دنیوی لیڈر اور سردار بھی۔ ان سے مطالبہ کر رہے تھے کہ اپنے وطن فلسطین چلو اور ظالم و غاصب قوم عمالقہ کو نکال کر وہاں حکومت کرو۔

تازہ تاریخی، اثریاتی، معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ مصر سے ہجرتِ بنی اسرائیل کا زمانہ ۱۴۴۱ ق۔م کا ہے اور فلسطین پر بنی اسرائیل کی فوج کشی کا زمانہ ۱۴۰۱ ق۔م کا۔ اس حساب سے حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے، بلکہ عجب نہیں کہ آپ کی عمر کے بالکل آخر حصہ کا زمانہ ہو۔ توریت کے صحیفہ استثنار کے باب اول سے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسی صحیفۂ استثنار ہی میں تصریح بھی موجود ہے کہ آپ نے یہ تقریر دریائے یردن کے کنارے اپنے واقعۂ خروج مصر کے چالیسویں سال کے گیارہویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو ارشاد کی تھی۔

۱

اور یہ شبہ نہ گزرے کہ اسرائیل کو بادشاہت اس وقت تک کہاں ملی تھی۔ فتح کنعان (فلسطین) ہی اس کے بعد ہوئی۔ اور داؤدؑ وسلیمانؑ کی بادشاہتوں کا زمانہ تو اس کے صدیوں بعد کا ہے۔ لفظ **مُلُوک** کی تصریح ابھی چند منٹ قبل آپ کے سامنے گزر چکی، اور بالفرض اگر کسی کو ملوک کے معنی بادشاہ لینے پر اصرار ہی ہو، وہ یہ سُن لے کہ قرآن اپنے زورِ بیان میں، جو واقعات مستقبل میں پیش آنے قطعی ویقینی ہوتے ہیں انھیں برابر صیغۂ ماضی میں بیان کر جاتا ہے۔ بادشاہت بنی اسرائیل کی یقینی تھی۔ اور اس کے یقینی ہی ہونے کی بنا پر اسے بجائے مستقبل کے صیغۂ ماضی سے ادا کر دیا گیا۔

تقریر کی بیان کی ہوئی ۲ نعمتوں، نبوت وملوکیت کی تشریح ہو چکی تیسری نعمت ابھی باقی ہے۔

وَاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: تمھیں وہ چیز عطا کی ہے جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھی، یعنی دولتِ توحید، مذہبی حیثیت سے۔ انھیں خطبات میں دو ایک مقام پر یہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ دولتِ توحید من حیث القوم اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے۔ دوسری قومیں اور نسلیں شرک میں پڑی رہا کی ہیں۔ اور قوم اسرائیل شروع ہی سے اس شرف وفضل سے مشرف رہی ہے۔ ہمارے مفسرین کو (اللہ ان پر رحمت فرمائے) ایک عجیب دشواری اس مضمون کی آیتوں میں ہمیشہ پیش آتی رہی کہ اگر سب سے اشرف وافضل نسل اسرائیل کو مان لیا جائے تو پھر اُمتِ محمدی کے لئے کون سا مقام باقی رہ جائے گا۔ اشکال اور دشواری کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ مقابلہ تو یہاں دنیا کی قوموں اور نسلوں کا ہو رہا ہے اور ان میں سب سے اشرف وافضل نسل اسرائیل ہی ہے۔ یعنی بجائے مشرکانہ خرافات، وہم پرستوں کے عقیدۂ توحید اور اس کے لوازم رسالت، وحی، ملائکہ، حشر ونشر وغیرہ کی حامل یہی ایک قوم رہی ہے۔ لیکن اُمتِ محمدی نام کسی نسل یا قوم کا کب ہے؟ اس کی بنیاد تو بجائے نسل ونسب کے صرف عقائدِ صحیحہ پر ہے، اور

اسرائیلی ہو کہ اسماعیلی، عرب ہو کہ عجم، حبشی ہو کہ چینی، گورا ہو کہ کالا ہو، مغربی ہو کہ مشرقی، جو کوئی بھی توحید و رسالت کا کلمہ پڑھنے لگے، بس وہی اُمت محمدی میں داخل و شامل ہے۔ خاتم النبیینؐ کی نبوت جس طرح سلسلۂ انبیاء کی خاتم ہوئی ہے، قومی و نسلی برتری کی بھی تو قاطع ہے۔

﴿۴۹﴾

قرآن فہمی میں ایک بڑا مانع، ہم اُردو دانوں کے لیے، یہ آپڑا ہے کہ جو الفاظ عربی اور اُردو میں مشترک ہیں، انھیں قرآن میں بھی، اُن کے اُردو ہی مفہوم میں سمجھ لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تو بیشک اشتراک لفظی کے ساتھ معنوی بھی ہے لیکن کثرت سے یہ ہے کہ لفظ اصلاً آیا تو اُردو میں عربی ہی سے، لیکن اپنا مفہوم پورے کا پورا اپنے ساتھ نہ لایا۔ کہیں کچھ تھوڑا سا مفہوم لے کر آیا، اور باقی وہیں چھوڑ آیا۔ اور کہیں ایسا ہوا کہ یہاں آکر پھیل گیا، اور وہ مطالب اپنے اندر پیدا کر لئے جو عربی داں کے خیال میں بھی نہ آئے۔ اور کہیں تنگی اور وسعت دونوں سے الگ ایک نیا ہی مفہوم پیدا ہو گیا۔ لفظ "وسیلہ" اور لفظ "جہاد" بھی ایسے ہی ہیں، جن کا اُردو مفہوم ان کے عربی مفہوم سے بالکل جداگانہ ہے اور اس کی مثال سورۃ المائدہ ہی کی اس آیت میں مل جاتی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱتَّقُوا ٱللَّهَ وَٱبۡتَغُوٓا إِلَيۡهِ ٱلۡوَسِيلَةَ
وَجَٰهِدُوا فِي سَبِيلِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ۝ (آیت ۴۰)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، اور اس کا قرب حاصل کرو اور اس کی راہ میں جد و جہد کرو، تاکہ تم ہر طرح فلاح پاؤ۔

عربی میں وسیلہ کے معنی قرب یا نزدیکی کے ہیں۔ ابن جریر طبری، قرطبی، ابن قتیبہ سب نے یہی معنی لئے ہیں۔ یہی معنی متعدد تابعین، مجاہد، حسن، قتادہ، عطار وغیرہ سے نقل ہوئے ہیں۔ اور قرب حق کا بہترین وسیلہ احکام الٰہی کی تعمیل ہے۔ ابن عباس صحابی نے کہا ہے:

اطلبوا الیہ القرب فی الدرجات عند اللہ ۔

اور تفسیر کبیر میں ہے :

فالمراد طلب الوسیلۃ الیہ فی تحصیل مرضاتہ وذلک بالعبادات والطاعات ۔

اور وسیلہ سے مراد مرضیات الٰہی کی طلب و تحصیل ہے ۔ عبادتوں اور طاعتوں کے ذریعہ سے ۔

ہمارے اِن جن لوگوں نے وسیلہ کے تحت میں بزرگوں سے استعانت اور اولیا ، اور انبیاء سے استغاثہ جائز رکھا ہے ، انھوں نے عربی کے وسیلہ بمعنی قُرب کو ، اُردو کے وسیلہ بمعنی ذریعہ کا مرادف سمجھ لیا ہے ۔ اور ایسی شدید وفاحش غلطیوں کی مثالیں شاذ نہیں کثیر الوقوع ہیں ۔ علامہ آلوسی بغدادی ، صاحب روح المعانی نے تفصیل سے اس موضوع پر کلام کیا ہے اور لکھا ہے کہ :

> "میت یا غائب شخص سے دُعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی بھی عالم کو شک نہیں ، اور یہ ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف میں سے کسی نے بھی نہیں کیا ہے ۔ حضرات صحابہ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہوا ہے ۔ لیکن کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ اس نے صاحب قبر سے کچھ طلب کیا ہو" ۔

آخر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

> " حضرت عبداللہ ابن عمر کا ، اتباع سنت تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ جب روضۂ نبویؐ پر حاضری دیتے تو صرف اس قدر کہتے کہ السلام علیکم یارسول اللہ ، السلام علیک یا ابابکر ، السلام علیک اور اس سے زائد کچھ نہ کہتے ، نہ کچھ مانگتے ۔ نہ سرورِ عالم سے اور نہ ان کے مکرم مقربین سے" ۔

اور وسیلہ کی طرح عربی لفظ جہاد کو بھی لوگوں نے اُردو کے جہاد کے معنی میں لے رکھا ہے۔ اردو میں جہاد ایک دینی اصطلاح کی حیثیت سے قتال فی سبیل اللہ کے معنی رکھتا ہے، اور اسی کے لئے مخصوص و محدود ہو چکا ہے۔ عربی میں یہ حصر و قید کچھ بھی نہیں۔ عربی میں جہاد کا مفہوم بہت وسیع و عام ہے۔ ہر سخت کوشش جو کسی بھی دینی غرض سے کی جائے۔ خصوصاً دشمنانِ دین کے مقابلہ میں جہاد ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جہاد جس طرح میدان رزم میں تیر و تفنگ سے ہو سکتا ہے، اسی طرح بزم میں مال و دولت سے اور زبان و قلم سے بھی ہو سکتا ہے۔

اور انھیں دو اعمال، ایک طلب قرب، اور دوسرے جہاد پر ترتب فلاح کا ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں خوش خبری ہے کہ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ، تاکہ تم فلاح یاب ہو جاؤ۔ اور فلاح کے تحت میں دنیا و آخرت کی ہر کامیابی اور ہر کامرانی آ گئی۔

(۵۰)

تبلیغ کی دین میں جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔ ایک مقام اسی طرح کا، اسی سورۃ المائدہ میں ہے۔ اور بہت معنی خیز ہے:

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۝ وَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ۝ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ
اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (آیت ۶۷)

اے ہمارے پیمبر پہنچا دیجئے جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اُترا ہے، اور اگر یہ آپ نے نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیام پہنچایا ہی نہیں۔ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ یقیناً اللہ کافروں کو راہ نہ دے گا۔

پہلے انداز خطاب دیکھیے، اَیُّهَا الرَّسُوْلُ تبلیغ کے موقع پر اور اس کے سیاق میں یہ خطاب

خود ہی کتنا بلیغ و حکیمانہ ہے۔ گو اے مخاطب تمہاری تو حیثیت ہی تمام تر رسول کی ہے پیام پہنچانے والے کی ہے۔ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ میں قرآن مجید کا سارے کا سارا ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ باقی جو چیزیں وحی خفی کے راستہ سے رسول اللہ کو تعلیم ہوئی تھیں وہ بھی اس عموم کے اندر شامل ہیں۔ ابن عباس صحابی سے یہی معنی منقول ہیں، اور فقہائے مفسرین میں سے قرطبی، عیاض اور نسفی اسی طرف گئے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے کوئی بات بھی اگر چھپائی تو رسالت کا حق ہی نہیں ادا کیا ــــ اس میں رد آگیا اُن اہل باطل کا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نعوذ باللہ، رسولؐ نے اُمت کو قرآن پورے کا پورا نہیں پہنچایا، بلکہ کسی خوف یا کسی مصلحت سے اُسے کسی قدر ناقص صورت میں پہنچایا ہے۔ درحقیقت یہ ہے بھی مرتبۂ رسالت سے بہت ہی گری ہوئی بات کہ پیمبر جیسا عبد کامل، کوئی حکم شریعت کسی کی مروت یا کسی کے دباؤ سے چھپا جائے، اور عائشہ صدیقہؓ نے کیسی لطیف اور سچی بات اس موقع پر کہی ہے کہ اگر آپؐ نے کوئی بھی جزو قرآن کا چھپایا ہوتا تو وہ یہی ہوتا۔ اور اگر یہ کہئے کہ قرآن نے اس درجہ مستبعد مفروضہ کو آپ کی جانب منسوب ہی کیسے کیا؟ تو قرآن نے تو محالات عادی بلکہ محالات عقلی تک کا ذکر و بیان قرآن ہی میں کر دیا ہے۔ مثلاً تاکید توحید کے سلسلہ میں ایک کے بجائے دو خداؤں کا فرض کرنا، اور اس حکم کو اور مؤکد بنانے کے لئے تیقن کے لہجہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، آپ تشویش و فکر نہ کریں، یہ آپ کو ہرگز ہلاک کرنے پر قدرت نہ پاسکیں گے ــــ اور یہاں یہ سوال نہ کیجیے کہ جب محفوظیت کا وعدہ ہو چکا تھا تو پھر جنگ اُحد میں جسم مبارک کو جراحتیں کیسے پہونچیں۔ مفسروں نے یہ سوال پیدا کر کے جواب اپنے اپنے رنگ کا دیا ہے۔ لیکن سب سے صاف اور بے تکلف جواب مفسر تھانویؒ کے قلم سے نکلا ہوا یہ ہے کہ وعدہ محفوظیت تو سیاق تبلیغ میں کیا گیا ہے، اس لئے اس کا تعلق بھی قدرۃً بس اتنی ہی محفوظیت سے ہے، جو آپ کے فرائض تبلیغ میں مانع نہ ہو۔ بالکلیہ محفوظیت

نہ مقصود تھی، نہ ہوسکتی تھی۔ مرض، زخم، صدمہ و غم وغیرہ تو حکمت تکوینی کے ماتحت رفع درجات اور بلندیٔ مراتب کے لئے ضروری ہیں۔ یقیناً اللہ اس کا موقع نہ دے گا کہ آپ کے دشمن آپ تک پہونچ کر تبلیغ دین میں کوئی رکاوٹ پیدا کرسکیں اور فقہا نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ رسول ہی کی طرح نائبان رسول، یا حکماء امت کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ شریعت میں اخفاء و کتمان سے کام لیں۔

(۵۱)

آج کی صحبت میں، اور کچھ ہی دیر پہلے، آپ سن چکے ہیں کہ جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح ہی تو خدا ہیں، قرآن اُن کی تکفیر قطعی ظاہر کرچکا، اور انھیں دائرۂ شفاعت و سفارش سے باہر رکھ چکا ہے۔ اب ایک دوسرے عقیدہ کو بھی سُن چلیے، جو پہلے عقیدہ کی طرح ایک محدود فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دنیائے مسیحیت میں خوب رچا بسا ہوا، اور قرآنی نصرانیت سے الگ، اور کہیں پست و فروتر ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ (آیت ۷۳)

یقیناً وہ (لوگ بھی) کافر ہوگئے، جنھوں نے کہا خدا تین میں سے ایک ہے۔

یہ کھلا ہوا اشارہ عقیدۂ تثلیث کی جانب ہے، یعنی اس عقیدہ کی طرف کہ باپ، بیٹا، روح القدس، یہ تینوں اقنوم (اصل) خدا ہیں، منفرداً بھی اور مجموعاً بھی۔ الگ الگ خدا ہیں۔ اور تینوں مل کر بھی خدا۔

اور اس وقت دنیائے مسیحیت کا عام عقیدہ یہی ہے۔ قرآن نے اس عقیدہ پر صاف کفر کا اطلاق کیا ہے، اور اس کے ماننے والوں کو کافر کے لقب سے یاد کیا ہے، اور نصاریٰ و اہل کتاب سے انھیں الگ کردیا۔ یہ سب نرے کھرے کافر ہیں، ایمان کے دائرہ سے خارج، اور معاً حقیقت حال بھی بیان کردی۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (آیت ۷۷)

اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی معبود نہیں، بجز خدائے واحد کے، اور یہ لوگ اگر اپنے اِن اقوال سے باز نہ آئے تو ان میں جو لوگ کافر رہیں گے ان پر عذاب دردناک واقع ہو کر رہے گا۔

کوئی خدا بجز ایک کے نہیں، نہ عدد و شمار کے لحاظ سے، نہ کسی اور اعتبار سے۔ مِنْ اِلٰهٍ میں مِنْ زائد، کلیت یا استغراق کے لئے ہے۔

عذاب واقع ہو کر رہے گا، آخرت میں تو بالیقین، اور دنیا میں بھی حسب مصلحت تکوینی وعید ان کے حق میں ہے، جن پر اس عقیدہ کی گمراہی پوری طرح واضح ہو کر رہی، اور پھر بھی اسی پر قائم ہے مِنْهُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ اس نے یہ صاف کر دیا کہ علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ دنیا میں بہت سے لوگ اپنے اس کافرانہ عقیدہ سے باز آجائیں گے اور ایمان صحیح لے آئیں گے۔ وہ لوگ اس وعید سے خارج ہیں۔ حقیقت تثلیث کا بیان ایک ہی آیت بعد پھر ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۝ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (آیت ۷۹)

مسیح ابن مریم کچھ بھی نہیں، بجز ایک رسول کے، جن سے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اور ان کی ماں ولیہ تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھئے کہ ہم کس طرح صاف دلائل اُن کے سامنے بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھئے وہ کس طرح اُلٹے چلے جاتے ہیں:

یعنی محض رسول خدا۔ ایک[۱] طرف نہ خدا، نہ فرزند خدا، نہ مظہر خدا، نہ مثیلِ خدا، اور دوسری[۲]

طرف نہ ساحر، نہ شعبدہ باز۔ صحیح مرتبہ بس ایک رسول کا، جیسے کہ پہلے بھی رسول آ چکے ہیں۔ ابن مریم، لا کر یہ یاد دلایا کہ ایک عورت کے بطن سے تھے، اور اس لئے بجز بشر کے، اور کیا ہو سکتے تھے۔ اور ماں صدیقہ تھیں، یعنی ولیہ تھیں، نہ مادرِ خدا، اور نہ معاذ اللہ کوئی مشتبہ چال چلن، والی۔ اور دونوں كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ۔ اپنے سارے تقویٰ کے باوجود، اس مادی اور بشری جسم کے ساتھ، ساری مادی و جسمانی ضرورتوں کے محتاج۔ اتنی صاف، سیدھی، صریح حقیقت سن کر بھی ان تثلیث پرستوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کے خرافات میں پڑے ہوئے ہیں۔

"اقانیم میں تینوں خدا کی وحدت ایک ہے۔ تین خدا نہیں"۔

"ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے، اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے"۔

"اقنوم وجود باپ ہے، اقنوم جان، بیٹا، اور اقنوم علم، روح القدس"

یہ صرف نمونے کے طور پر چند مسیحی اسرار دینیات نقل کر دیے گئے۔

اب آج کی صحبت کے اختتام پر وہ آیت ملاحظہ کیجیے، جس میں مسیحی شرک کی جڑ بنیاد کی پوری نشان دہی کر دی ہے۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ٥ (آیت ۸۲)

آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، اور ان لوگوں کے خیالات پر مت چلو، جو پہلے (خود بھی) گمراہ ہو چکے ہیں، اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور راہِ راست سے بھٹک چکے ہیں۔

اس میں صاف اشارہ اس کا آ گیا کہ مسیحیت کی گمراہیاں و بدعقیدگیاں، کسی دوسری گمراہ و کجرو اور زمانہ مسیح سے قبل کی قوم کی ریس اور تقلید نے پیدا کی ہیں۔ اور اَهْوَآء کہتے ہیں لغو و بے بنیاد

خیالات، من گھڑت عقائد اور خیالی ڈھکوسلوں کو۔ جو لوگ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ سے واقف ہیں، اور خود عالم و فاضل فرنگیوں کی مرتب کی ہوئی (Biblical Criticism) پر نظر رکھتے ہیں، وہ ان پتوں کی باتوں پر عش عش کر اٹھیں گے۔

چھٹی صدی عیسوی کا ایک عرب امیؐ، آخر ان تاریخی حقائق سے باخبر ہو ہی کیسے سکتا تھا! تا وقتیکہ عالم الغیب اسے براہ راست تعلیم نہیں دے رہا تھا۔

قدیم مصری شرک، جو یونانیوں میں پوری طرح حلول کر آیا تھا، اور بڑے بڑے یونانی فلسفی، اسکندریہ کے مرکز عقلیت۔ روشن خیالی سے مرعوب و متأثر تھے، حضرت عیسیٰ کی تعلیم جب شروع شروع پھیلی تو اس پر یہود کے اکابر،

انھیں یونانیوں کے آگے گردن ڈال چکے اور ان سے حلول (LOGOS) وغیرہ کے عقیدے اخذ کر چکے تھے

مسیحیوں نے ان مشرکانہ خرافات کو بلا تامل قبول کر لیا، اور پھر پولوس (سنٹ پال) نے حضرت مسیح کے تعلیمات کو تمام تر مسخ کر کے مسیحیت کو یونانی شرک کی ایک شاخ ہی بنا دیا۔

آخر میں رہی سہی کسر رومیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کر دی۔

موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری شرک، یونانی شرک اور رومی شرک کی صدائے بازگشت ہیں، اور بس!

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پانچواں خطبہ

رکوع (۵۲)

مسیحیت، تثلیث اور مسیح پرستی کا رد سورۂ آل عمران میں اچھا خاصہ ہو چکا ہے لیکن سورۃ المائدہ میں بھی کچھ کم نہیں۔

دو چار آیتیں اس موضوع سے متعلق پچھلے خطبہ میں گزر چکیں۔ اب سورہ کے ختم کے قریب اسی موضوع کی مناسبت سے پہلے کچھ فقرے تذکیر و موعظت کے آئے ہیں، وہ بھی ملاحظہ ہوں۔ ابتدا میں ایک عام تذکرہ حشر میں پیمبروں سے سوال و جواب کا ہے، جو ایک مؤثر مرقع کشی کا کام دیتا ہے:

يَوۡمَ يَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ‌ؕ قَالُوۡا لَا عِلۡمَ لَنَا‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ۝ (آیت ۱۰۹)

(اس دن سے ڈرو) جس دن اللہ پیمبروں کو اکٹھا کرے گا، پھر ان سے پوچھے گا کہ تمھیں کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں چھپی ہوئی باتوں کو خوب جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔

انبیاء کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں کہ ہمارے پیچھے ان لوگوں نے کیا کیا کہا! یا یہ کہ ان کے واقعی عقیدے کیا تھے۔ ہم تو ان کے صرف ظاہری اعمال و اقوال کو جانتے ہیں۔ باطن کا

علم تو تجھی کو ہو سکتا ہے ۔ اور جزا تو صرف اصل عقائد ہی پر ملے گی ۔ اور یہی جواب غلبۂ خشیت سے ادبًا و احترامًا بھی ادا ہو گا ۔ گویا وہ کہیں گے کہ تیرے علم کامل و محیط کے آگے ہمارا علم ہیچ ہے ۔ و کچھ ہمیں علم ہے بھی اُس کا ہم سے عالِم تر تو تو ہی ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں جو کچھ علم حاصل ہے وہ محض درجۂ ظن کی چیز ہے ۔ اور آج دن کشفِ حقائق کا ہے ۔ جب محض ظن کام نہیں دے سکتا ۔ آج علم ہی کام دے گا ۔ اور وہ تجھی کو حاصل ہے ۔

اس عمومی تمہید کے بعد ذکر خصوصی حضرت عیسیٰ کا شروع ہوتا ہے ۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ إِذْ أَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيْلَ ۚ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِإِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِيْ ۚ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِيْ ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (آیت ۱۱۰)

(اور وہ وقت یاد میں رکھو) جب اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے اور اپنی والدہ کے اوپر یاد کرو، جب کہ میں نے تمہاری تائید روح القدس کے واسطہ سے کی تھی ۔ تم آدمیوں سے کلام گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی ۔ اور جب کہ میں نے تمہیں تعلیم دی کتاب و حکمت کی اور توریت و انجیل کی، اور جب تم پرند جیسی ایک شکل وجود میں لاتے تھے میرے حکم سے، اور پھر تم اس کے اندر پھونک مارتے تھے تو وہ پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے، اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو چنگا کر دیتے تھے میرے حکم سے، اور جب تم مُردوں کو نکال کھڑا کرتے تھے میرے حکم سے،

اور جب کہ میں نے روک رکھا تھا بنی اسرائیل کو تم سے، جب تم ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تھے۔ پھر ان میں سے جو کفر اختیار کئے رہے وہ بولے کہ یہ تو کچھ نہیں، بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

اُذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ نے صاف کر دیا ہے کہ انعامات کا سرچشمہ تو وہی ایک ذات تبارک و تعالیٰ ہے۔ مسیح اس کے صرف ایک نعمت یافتہ و مقرب بند اور والدہ مسیح اس کی صرف ایک نعمت یافتہ اور معزز بندی ہیں۔

لفظ عِیسَی ابنَ مَریَمَ میں یاد دلایا ہے کہ وہ ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے نہ کہ ابن اللہ۔

عَلٰى وَالِدَتِكَ کے طریق تخاطب سے مرشد تھانویؒ نے استنباط یہ کیا ہے کہ اہل اللہ کی اولاد میں ہونا بھی ایک نعمت و شرف ہے۔ رہی آپ کی تعلیم کتاب و حکمت' تو سارے ہی پیغمبر اس لحاظ سے شاگرد حق تعالےٰ ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ہمارے حضرت خاتم النبیینؐ۔

اور اَلْكِتٰبَ سے سیاق میں مراد جنس کتاب ہے۔

اب رہے وہ خوارق و عجائب جو آیت کے اس ٹکڑے میں گنائے گئے ہیں' ان سب کی تشریح ایک پچھلے خطبہ میں سورۂ آل عمران کی آیتوں کے حوالہ سے اور ان کے ذیل میں عرض کی جا چکی ہے

بِاِذْنِیْ کی تکرار بڑی ہی اہم اور قابل غور ہے۔ خوارق و عجائب، جو کچھ بھی ہوئے بادی النظر میں وہ کیسے ہی عجیب و غریب ہوں۔ بہرحال تھا وہ سب کچھ کسی نہ کسی قانون الٰہی ہی کے ماتحت، قانون تکوینی ہی کی کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت۔ ہر اعجوبہ میں خالق کائنات ہی کا کوئی نہ کوئی قانون کارفرما تھا۔ معجزہ کی حقیقت جیسا کہ پہلے ہی عرض ہو چکا ہے' بس اتنی ہی ہے کہ وہ خارق عادت ہو جس کا ظہور پیمبر کے ہاتھ پر' منکروں اور کافروں پر پیمبر کی تائید غیبی اور نصرت الٰہی کے اظہار کے لئے کرایا جائے۔ اور خارق عادت وہ واقعہ یا فعل ہے

جو کائنات مادی میں بندوں کے سمجھے اور قرار دیے ہوئے کسی آئین و قاعدہ سے الگ ہو۔ مگر فطرت کا عام قانون و قاعدہ تو بندوں ہی کے مشاہدات و تجربات سے اخذ کیا ہوتا ہے مثلاً ہمارے ملک میں جون کے مہینہ میں تیز گرمی اور دسمبر کے مہینہ میں تیز سردی عموماً و عادۃً ہوتی ہے۔ اب کسی پیمبر کی دعا سے جون میں برف پڑنے لگے اور دسمبر میں لُو چلنے لگے تو یہ اس پیمبر کا معجزہ ہوا۔ مادیین یا نیچر پرستوں کی پہلی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے بندوں کے تجربہ و مشاہدہ کو خود خالق کی طرف سے کسی مستقل قانون یا قاعدہ کا اعلان سمجھ لیا۔ اور دوسری غلطی یہ کہ وہ قاعدہ و قانون کو قانون ساز اور قاعدہ گر کی مرضی و ارادہ سے بے نیاز، مستقل و مستمر، لایزال حقیقتیں قرار دے بیٹھے۔

تَخْلُقُ یہاں جس سیاق میں آیا ہے، اس کے لحاظ سے تخلق کے معنی صورت بنانے کے ہیں۔ نیست سے ہست کرنے کے نہیں۔ اور صاحب کشاف نے اسے بھی صاف کر دیا کہ فَتَنْفُخُ فِیھَا میں ضمیر ھا ھَیْـئَة کی طرف نہیں کَھَیْـئَة کے کاف کی جانب ہے۔

اخیر آیت میں یہ جو آیا ہے کہ منکر اور باغی اسرائیلیوں کا حضرت مسیح پر مدت دراز تک بس نہ چل سکا، تو یہ اشارہ اس تاریخی حقیقت کی طرف ہے کہ یہود نے آپ پر غلبہ حاصل کرنے کی بار بار کوشش کی اور بار بار ناکام رہے۔ چنانچہ انجیل یوحنا میں ہے کہ:

> ”انھوں نے یسوع کو مارنے کا بیڑا اٹھایا تھا، مگر یسوع چھپ کر ہیکل سے نکل گیا۔“ (باب ۸، آیت ۵۹)

اور دوسری جگہ اسی انجیل میں ہے:

> ”انھوں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔“
>
> (باب ۱۰، آیت ۳۹)

البَیِّنَات کے تحت میں دلائل عقلی اور خوارق و معجزات سب آ گئے۔

5|190

(۵۳)

اسی سورۃ المائدہ کے بالکل ختم پر ایک اور بڑا مؤثر مکالمہ حشر کے دن کا مذکور ہے۔ اور اس میں ذکر مسیحیت اور مسیح پرستی کا ایک نئے عنوان و اسلوب سے ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ
اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ (آیت ۱۱۶)

(ذہن میں لے آؤ وہ وقت) جب اللہ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم یہ تو بتاؤ کہ کیا تم لوگوں سے یہ کہہ آئے تھے کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لینا۔

آیت میں تو لفظ قَالَ ہے اور ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ صیغہ ماضی کا ہے۔ لیکن یہ بھی قرآنیات کا ہر ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ قرآن میں ذکر جب کسی مستقبل واقعہ سے متعلق آتا ہے تو اظہار اس سے قطعیت کا کرنا منظور ہوتا ہے یعنی جس چیز کا آئندہ ہونا قطعی اور یقینی ہوتا ہے، اس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے جیسے وہ واقع ہو چکی۔ تو قرآن یہاں بھی اپنے اسی عام اسلوب بیان کے مطابق کہتا ہے کہ ذرا اس منظر کو اپنے سامنے لے آؤ کہ جب حق تعالیٰ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم یہ تعلیم دے آئے تھے کہ خود تم کو اور تمہاری والدہ کو بھی اللہ کے علاوہ معبود ٹھہرا لیا جائے؟

مسیح پرستی تو خیر موجودہ رائج الوقت مسیحیت کے مرادف ہے ہی، مریم پرستی بھی دنیائے مسیحیت کا کوئی مخفی اور نامعلوم واقعہ نہیں (Divine Virgin) "خدائی باکرہ" ان کا کھلا ہوا لقب ہے، نذریں اور منتیں ان کی مانی جاتی ہیں، نیازیں ان کے نام پر ہوتی ہیں، دعائیں انھیں مخاطب کر کے کی جاتی ہیں، کیتھولک گرجوں میں قد آدم تصویر ان کی لگی رہتی ہے، اور ماں کے آگے رسوم پرستش بجا لائے جاتے ہیں۔ کتابی حوالوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں اس خاکسار کی

انگریزی تفسیر۔

آخرت میں جو سوال حضرت مسیح سے ہوگا، ظاہر ہے کہ اس سے محض استفہام مراد نہیں، بلکہ مریم پرستوں پر مزید حجت قائم کرنا، اور انھیں شرمندہ و خجل کرنا اور انھیں آپ اپنی نظر میں ذلیل کرنا ہے۔ تخاطب میں لفظ مسیح نہیں بلکہ محض اصلی نام عیسیٰ ہے ابن مریم کے اضافہ کے ساتھ، اور اس حقیقت کے یاد دلانے کو کہ وہ انسان ہی نہیں انسان زادے بھی ہیں!

یہ تو ہوا سوال۔ اب وہ جواب کے پہلے ہی فقرے میں عرض کرتے ہیں:

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۚ

عرض کریں گے کہ پاک ہے تیری ذات۔ یہ تو مجھ سے ممکن نہ تھا کہ میں ایسی بات کہہ دیتا جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا۔

یعنی بار الٰہا تیری ذات برتر و بالا ہے۔ ہر شرک کی آلودگی سے اور ہر ایسے انتساب سے جو تیرے شایان شان نہ ہو۔ بھلا میری مجال تھی کہ میں ایسا صریح کلمۂ باطل زبان سے نکال سکتا —— اور آگے عرض کریں گے:

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۚ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ (آیت ۱۱۶)

اور اگر میں نے (کہیں) کہا ہوتا تو ضرور ہی تجھے اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے۔ بیشک تو تو پوشیدہ چیزوں تک کا خوب جاننے والا ہے۔

بالفرض میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی۔ اور جب تیرے علم میں نہیں تو ظاہر ہے کہ واقع ہی نہیں ہوئی۔ تیرے علم کامل و محیط کو میرے علم ناقص و محدود سے نسبت ہی کیا ہے؟ اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے۔ تجھ پر تو ہر غیب روشن ہے۔ آئینہ ہے۔ امام رازیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ سوال کا جواب براہ راست دینے کے بجائے

اسے علم الٰہی پر محمول کر دینا ادب و احترام کے تقاضے سے زیادہ مطابق ہے۔ اور بہ طور تتمیم و تکملہ یہ خادم عرض کرتا ہے کہ مسیح کا یہ کلام عبدیت و عبودیت کا بھی شاہد عادل ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ میں تعلیم فلاں اور فلاں دے آیا تھا، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں تو وہی تعلیم دے آیا تھا جس کا تو نے حکم دیا تھا۔ اور یہ پیام بھی میری اپنی طرف سے نہ تھا، بلکہ یہ بھی تیرے ہی ارشاد کی تعمیل تھی۔

قرآن آپ کے جواب کی مزید حکایت یوں بیان کرتا ہے:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ

میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا سوا اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا، وہ یہی کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔

یہ تو ہوئی قرآن مجید کی حکایت۔ لیکن خود انجیلوں میں اتنی تصحیف و تصرف کے بعد بھی یہ تعلیم لکھی چلی آتی ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے:

”یسوع نے اس سے کہا“ اے شیطان دور ہو، کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا اور فرشتے آ کر اس کی عبادت کرنے لگے (باب ۴ آیت ۱۰-۱۱)

اور انجیل لوقا میں ہے:

”یسوع نے جواب میں اس سے کہا کہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔“ (باب ۴، آیت ۸)

جواب مسیح ابھی ختم نہیں ہوا۔ چل رہا ہے:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (آیت ۱۱۷)

میں اس پر آگاہ رہا، جب تک میں ان کے درمیان رہا۔ پھر جب تو نے مجھے

اُٹھالیا (جب سے) تو ہی ان پر نگراں ہے۔ اور تو تو گواہ ہر چیز پر ہے۔

غور کیجیے کلام میں، ایک بار پھر اپنی عبدیت و بشریت کا اور حق تعالیٰ کے علمِ محیط و کامل کا اثبات ہے۔ کہتے ہیں کہ میں جب تک دنیا میں موجود رہا، اپنی اُمت کا حال میرے علم و مشاہدہ میں تھا۔ پھر تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا۔ اس کے بعد سے مجھے کیا خبر اس کا علم تو بس تجھی ہمہ وقتی نگراں کو رہ سکتا ہے۔ اور آگے چلیے:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ
أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (آیت ۱۱۸)

تو اگر انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو انھیں بخش دے تو بھی تو، زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

عرض کرتے ہیں کہ تو مالک و مختار ہے، ہمہ داں و ہمہ تواں ہے۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ معاملہ کر۔ اگر سزا کا معاملہ کرے تو میں تجھ میں اور تیرے بندوں کے درمیان دخل دینے والا کون، اور اس کی مجھے کہاں مجال۔ اور اگر تو انھیں معاف ہی کر دینا چاہے تو کون تجھے روک سکتا ہے۔ تو سب پر غالب اور تیرا ارادہ سب پر حاکم و مقتدر، اور اسی کے ساتھ تو حکیم مطلق بھی۔ تیرا کوئی بھی فیصلہ حکمت و مصلحت تکوینی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ تو کرے گا تو وہی جو عین آئینِ حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

یاد کر لیجیے کہ یہ ساری گفتگو دنیا میں نہیں، قیامت میں ہو رہی ہے، جب کوئی محل ہی شفاعت کا کافروں اور منکروں کے حق میں باقی نہ رہے گا۔ یہیں سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے اس کلام میں کوئی شائبہ شفاعت و سفارش کا، باوجود ان کے پیمبر جلیل القدر ہونے کے نہیں۔ بلکہ تفویض یا سپردگی تمام تر اللہ کی طرف ہے۔

اور ضمناً اس سے تردید بھی مسیحیوں کے اس عقیدہ کی نکل آئی کہ قیامت میں عدالت کا کام خدا کے نہیں، خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا۔ انجیل یوحنا میں ہے:

"باپ کسی کی بھی عدالت نہیں کرتا، بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے پر رکھا ہے۔" (باب ۵، آیت ۱۳)

ان سارے مکالمات و مخاطبات کے بعد قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ (آیت ۱۱۹)

اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے، جب سچوں کے کام ان کا سچ آئے گا، ان کے لئے باغ ہوں گے، جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ اللہ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش رہا اور وہ اللہ سے خوش رہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

صِدِّقِیْن کا لفظ ابھی آپ نے سنا ہے۔ اس کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں عقیدۂ صحیح اور عمل صالح پر قائم رہے۔ اس کے تحت میں انبیاء کے علاوہ اولیار اور عام مومنین بھی داخل ہیں۔ عام مفسرین ادھر گئے ہیں کہ یہ اشارہ پوری آیت کے مضمون یعنی جنت اور خلود جنت اور رضوان الٰہی سب کی جانب ہے۔ لیکن امام رازی نے اپنی نکتہ سنجی سے یہ بات پیدا کی ہے کہ الفوز العظیم کا تعلق صرف نعمت رضوان الٰہی سے ہے۔ جس کے سامنے جنت کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ اور ان نعمتوں کو خلود ہی نہیں ابدیت بھی حاصل ہوگی۔

خلدین فیھا کے ساتھ اَبَدًا کی بشارت یہاں کی طرح اور بھی بار بار اہلِ جنت کے لئے آئی ہے اور اہلِ جہنم کے لئے اَبَدًا کی صراحت ایک ہی جگہ آئی ہے۔

(۵۴)

جاہلی قوموں کی ذہنیت بھی، ان کے عقائد کی طرح، ایک خاص قسم کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے

کثرت سے مقامات پر ان کے اعتراض نقل کر کے اس کا پردہ بھی فاش کیا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (انعام، آیت ۸)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان (پیمبر) کے اوپر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا۔

کہنے والا مشرکین ہی کا کوئی گروہ تھا۔ رسول کا بشر محض ہونا ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا۔ ان کی سمجھ میں اوتار یا مظہر خدا آجاتے تھے۔ یہ دیوتاؤں کے بلا تامل قائل تھے۔ خدا کے بیٹے بیٹیاں یقین کر سکتے تھے۔ یہ سب بآسانی ان کے لئے قابل قبول تھا۔ لیکن بشر کی رسالت کو ان کے دماغ کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ ہو سکے۔ برابر مطالبہ ان کی طرف سے ماورائے بشریت کا، خرق عادت کا ہوتا رہتا۔ فرشتہ کا بھی تخیل ان کے یہاں نہ تھا۔ البتہ پیمبر جب کہتے کہ فرشتہ میرے پاس پیام الٰہی لاتا تو اسے فرض کر کے یہ کہتے کہ اچھا، اگر ایسا ہے تو فرشتہ کو لاؤ یعنی دکھاؤ۔ حالانکہ قائل جب بھی نہ ہوتے۔ بلکہ سخن پروری کی عادت سے مجبور ہو کر مانگ ہی کیے چلے جاتے۔

آگے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ (آیت ۸)

حالانکہ اگر ہم فرشتہ اُتار دیتے تو قصہ ہی ختم تھا، پھر تو ان کو ذرا مہلت نہ ملتی۔

یعنی فرشتہ کا نزول دنیا میں اس طرح کہ وہ کافروں تک کو نظر آجائے یہ تو دستور الٰہی میں عین وقوع عذاب کے وقت ہوتا ہے، اس کے بعد مہلت کا امکان ہی کہاں ہے؟ عام فہم اُردو میں یوں سمجھئے کہ ایسے کھلے ہوئے معجزہ کے بعد عالم ناسوت کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور غیبیت کے پردوں کے بجائے مواجہہ میدان شہود کا ہو جاتا ہے۔ عالم برزخ اسی کا دوسرا نام ہے، اور وہ عالم کشف حقائق کا محل ہے۔

اور کافروں کی اصل حقیقت معذب ہی ہونا ہے۔ اس لئے اس طاری شدہ عالم برزخ کے وجود میں آتے ہی اس حقیقت کا ظہور اور سزا و عذاب کا ترتب لازم ہو جاتا ہے۔

ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ٥ آیت میں ثُمَّ اس اظہار اشدیت کے لئے ہے یعنی عذاب واقع تو ہو ہی گا، اس سے بڑھ کر یہ کہ مہلت ذرا بھی نہ ملے گی۔

گویا عذاب کی شدت سے بھی بڑھ کر اس کا فوری وقوع ہے ــــ مزید یہ کہ:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ٥ (آیت ۹)

اور اگر ہم فرشتہ ہی کو تجویز کرتے تو اسے بھی آدمی ہی بنا کر بھیجتے اور ان پر ہم (پھر) وہی اشتباہ ڈالتے، جس میں اب پڑے ہوئے ہیں۔

یعنی یہ لوگ اس انسانی صورت والے فرشتہ کے باب میں وہی احتمالات، وہی اشکالات، وہی کج بحثیاں پیدا کرتے، وہی کٹ حجتیاں نکالتے جو آج رسول اللہ سے متعلق نکال رہے ہیں۔

مَلَكٌ یا فرشتہ وہ نوری ہستی ہے، جسے انسان نہ اپنے عام و معروف حواس سے دیکھ سکتا ہے، نہ اس کے ملکات کے لحاظ سے اس کا اتباع کر سکتا ہے۔

لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا: اسے بھی شکل و جسم کے لحاظ سے انسان ہی کی جنس کا بنا کر بھیجتے تو تم اسے اپنی اِن آنکھوں سے دیکھ تو سکتے۔

لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ، یہ اشتباہ کا انتساب حق تعالیٰ کی بابت محض تکوینی حیثیت سے اور بہ طور مسبب الاسباب کے ہے۔ اس معنی میں اللہ سانپ کے زہر کا بھی خالق ہے، بیماری اور ہر دکھ درد کا بھی خالق ہے۔ بدی کا بھی خالق ہے۔ یہاں تک کہ شیطان کا بھی خالق ہے۔

اور ایمان، اسی کے ساتھ ذہن نشین کیجیے، کہ نام ہے قلب کی ایک کیفیت اختیاری کا باقی کسی ایسے معجزہ کا سامنے آجانا، جس سے انسان بالکل بے اختیار و مجبور ہو جائے، جیسا کہ فرشتہ کو اس کی اصل پر دیکھ لینا، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایمان اختیاری باقی ہی کہاں رہا۔ ایمان تو معتبر جب ہی تک ہے جب تک ایمان بالغیب ہے، جب انکشاف و شہود شروع

ہو گیا تو ایمان کا سوال ہی نہ رہا۔

(۵۵)

یہ سورۂ انعام چل رہی ہے اور اس کا بیشتر حصہ مسائل و احکام فقہی سے متعلق ہے تاہم دوسری قوموں کے عقائد و اعمال سے بھی جا بجا تعرض ہے۔ اہل کتاب کے متعلق ذکر ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ (آیت ۲۰)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ ان (صاحب) کو پہچانتے ہیں ایسا ہی جیسے اپنے ابنائے قوم کو پہچانتے ہیں۔

اس میں بنائے اشکال لفظ اَبْنَآءَ ھم ہے۔ مفسرین و مترجمین کثرت سے ادھر گئے ہیں کہ اس سے مراد ان کے بیٹے اور صلبی بیٹے ہیں۔ اور پھر اس اشکال کو حل کرنے کی ضمن میں طرح طرح کی توجیہات و تاویلات کی ہیں، حالانکہ اَبْنَآءَ ھُمْ سے مراد اگر ابنائے قوم لئے جائیں تو سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور مطلب صاف یہ نکلتا ہے کہ نبی آخر الزماں کی جو کھلی علامتیں ان کی کتب آسمانی خصوصاً توریت میں دی ہوئی ہیں، ان کے لحاظ سے انھیں آپ کا پہچان لینا اور آپ کی تصدیق کرنا ایسا ہی آسان ہے جیسے خود اپنی قوم و نسل کے انبیاء، انبیاء بنی اسرائیل کی شناخت۔ یہاں ذکر اہل کتاب کا مجموعاً و مشترکاً ہو رہا ہے، نہ کہ ان کے افراد کے لحاظ سے۔ سورۂ بقر کی آیت ۱۴۰ میں ایسے ہی لفظ آ چکے ہیں، اور کسی پچھلے خطبہ میں بھی وہ آیت آپ کی سماعت میں آ چکی ہے۔

(۵۶)

قرآنی قصوں میں ایک اہم و مشہور قصہ رئیس الموحدین حضرت ابراہیمؑ کے

ایمان توحیدی کا ہے۔ آپ کے والد جن کا نام عربی میں تارح آیا ہے اور انگریزی میں تلفظ تیرہ (Terah) ہے اور فلسطین کا قدیم مسیحی مؤرخ یوسیبیس (Eusebius) کے ہاں آشریا ہاشر ملتا ہے۔ قرآن مجید نے ان کا نام آزر بتایا ہے، وہ بُت پرست ہی نہ تھے بلکہ جیوش انسائیکلوپیڈیا کی روایت کے مطابق بُت ساز یا بُت فروش بھی تھے (جلد ۱۲۔ صفحہ ۱۰۷) اور آپ کا ملک کلدانیا یا بابل (موجودہ عراق) بُت پرستی اور ستارہ پرستی کے دُہرے شرک میں مبتلا تھا تو انھیں ابراہیمؑ کی سرگزشت قرآن کی زبان سے سُنئے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ آزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا آلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آیت ۷۴)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو۔ میں تمھیں اور تمھاری قوم کو کھُلی ہوئی گمراہی میں مبتلا پاتا ہوں۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (آیت ۷۵)

اور (اس لئے) ہم نے دکھا دی ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی حکومت، تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں سے۔

چنانچہ وہ خود مُوحّد کامل بھی ہو گئے، اور توحید کامل کے مبلّغ بھی۔ یعنی زمین اور آسمان پر حق تعالیٰ کی حکومت قاہرہ کے مشاہدہ سے ان کے دل پر توحید کا نقش جم گیا، اور ازدیادِ معرفت نے انھیں مزید ایقان تک پہنچا دیا۔

مَلَکوت سے مراد ہے وہ حکومت جو مخصوص ہے اللہ ہی کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ربوبیت اور مالکیت کے طریقے ابراہیم کے دل میں اُتار دیے۔ اور مشاہدہ

یا اِدراک کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ مادّی ہی آنکھوں سے ہو۔ چشم اعتبار یا بصیرت عقلی بھی مراد ہوسکتی ہے۔ اور ملکوت کی اضافت میں جو زمین کے حدود کے ساتھ سماوات یا آسمان بھی شامل کرلئے گئے، اس کی بلاغت اور زیادہ ہوجائے گی۔ جب یہ یاد کرلیا جائے کہ اہل کلدانیہ زمینی ہی شرک (بت پرستی) کے نہیں بلکہ آسمانی شرک ستارہ پرستی) کے بھی مجرم تھے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ
فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ (آیت ۷۶)

اور جب رات ابراہیم پر چھاگئی تو انھوں نے تارہ دیکھا۔ بولے یہی میرا پروردگار ہے۔ لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو بولے میں غروب ہوجانے والوں سے دل نہیں لگاتا/

اور نہ ایسوں کی الوہیت و معبودیت کا قائل ہوسکتا ہوں۔

ہرگز نہ سمجھئے کہ یہ سارا مکالمہ جو چل رہا ہے، ایک ہی وقت میں ہوا۔ چاند اور سورج کا مشاہدہ ایک ساتھ ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ یقیناً کل ماجرے کے مختلف اجزا مختلف اوقات میں ہوئے/

کَوْکَبًا تو لفظی اعتبار سے کوئی بھی ستارہ ہوسکتا ہے، لیکن لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ وہ کوئی بہت ہی روشن ستارہ ہوگا۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ پرستش سب سے زیادہ ان دو ستاروں کی ہوئی ہے: ایک مشتری (Jupiter) دوسرا زہرہ (Venus)/ ساتھ ہی ہمارے مفسرین قدیم کی صفائے طلب دیکھئے کہ ان کے قلم سے نام ان ہی دو ستاروں کے نکلے ہیں۔

خیر تو آپؑ نے کوئی روشن ستارہ دیکھا اور اپنی قوم پر حجت الزامی قائم کرنے کو انھیں دکھا کر کہا کہ یہی ہے ہمارا پروردگار یعنی تمھارے زعم و پندار میں۔ یہ طریق مخاطبت اردو،

فارسی، عربی، انگریزی، ہر زبان میں عام ہے کہ مناظرہ کے وقت مخالف کے قول کو اپنی زبان سے دُہرا دیتے ہیں اور لب و لہجہ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب کا قول اور خیال نقل ہو رہا ہے، بغیر اس کے کہ متکلم اس کی تصریح کرے۔ خود قرآن ہی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا اَیۡنَ شُرَکَآئِیَ؟ اب کہاں ہیں میرے شریک؟ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ تمھارے عقیدے کے مطابق میرے شریک۔ اور یہ مطلب کوئی احمق سے احمق بھی نہ لے گا کہ حق تعالےٰ اپنے شریکوں کا وجود تسلیم کر کے واقعی انھیں بلا رہا ہے۔

لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ سے آپ، نفی اُن کی مطلق معبودیت کی نہیں، بلکہ محبوبیت کی بھی کر رہے ہیں۔ آپ فرما رہے ہیں کہ جو ہستیاں خود ہی غیر ثابت اور تغیر پذیر ہوں، ان کے لئے جگہ میرے دل میں کسی عزت و قعت کی کیسے ہو سکتی ہے؟ عدم محبوبیت سیاق عبارت میں صاف عدم معبودیت کے مرادف ہے

فَلَمَّا رَاَ الۡقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ
لَئِنۡ لَّمۡ یَهۡدِنِیۡ رَبِّیۡ لَاَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّیۡنَ ○ (آیت)

پھر جب آپ نے دیکھا چاند کو چمکتے ہوئے تو بولے یہ میرا پروردگار ہے
لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے کہ اگر مجھے میرا پروردگار نہ ہدایت کرتا
رہے تو میں بھی گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں گا

لیکن اس کی ہدایت تو اول روز سے میرے شامل حال ہے، اور اس لئے میں توحید پر قائم ہوں ـــــ انبیاء کا یہ کمال عبدیت ہے کہ اپنے ہنر یا کمال کو اپنی جانب منسوب نہیں کرتے بلکہ اسے تمام تر عطیۂ الٰہی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ اور ستارہ پرستی کی طرح قمر پرستی تو جاہلی قوموں میں عام رہی ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمۡسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیۡ هٰذَاۤ اَکۡبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ
اَفَلَتۡ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ○ (آیت ۷۸)

پھر جب آپ نے سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو بولے یہی میرا پروردگار ہے، یہ سب سے بڑا ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے اے میری قوم والو، میں اس شرک سے بری (بیزار) ہوں جو تم کرتے ہو۔

مِمَّا تُشْرِكُوْنَ میں یہ نہیں فرمایا، کہ جس شرک میں میں اب تک مبتلا تھا اس سے نکل آیا، بلکہ یہ فرمایا کہ وہ شرک جس میں قوم والے مبتلا ہیں۔

هٰذَآ اَكْبَرُ، آفتاب تو اجرامِ سماوی میں سب سے زیادہ پوجا جاتا ہے، اور اہلِ کلدانیہ اس میں پیش پیش رہے ہیں۔

هٰذَا رَبِّيْ آپ کی گفتگو میں یہ لفظ تین بار آیا ہے، اور وہ تینوں موقعوں پر آپ نے اپنے ہم قوم مشرکوں کی ترجمانی لفظ رب ہی سے کی ہے، کہیں اللہ وغیرہ نہیں لائے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفتِ ربوبیت ہی میں لگی ہے، اور یہی آج تک چلا آرہا ہے۔ سورج دیوتا، چندرمان اور زہرہ و مشتری کو خالق کوئی بھی نہیں کہتا۔ مشرک انھیں مخلوق مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ ہمارے کارساز ہیں، ہماری مرادیں ان ہی سے وابستہ ہیں، ہماری دعائیں یہی سنتے ہیں، ہماری آرزوئیں یہی پوری کرتے ہیں۔ رب کا لفظ ایسے موقع پر معنویت سے لبریز ہے۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آیت ۷۹)

میں نے اپنا رُخ یکسو ہو کر اسی کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ (آیت)

اور ان کی قوم لگی ان سے جھگڑنے، بولے کیا تم جھگڑا مجھ سے اللہ کے بارے میں کرتے ہو، درانحالیکہ وہ مجھے ہدایت دے چکا ہے۔

حضرت خلیل اپنے دعوٰی پر دلیل بھی ساتھ ساتھ لاتے ہیں۔ چنانچہ لِلَّذِی فطر السّمٰوٰت والارض کہہ کر یہ فرما رہے ہیں کہ میں تو اس خدائے واحد کا قائل ہوں جو تمہارے خودساختہ زمینی اور آسمانی خداؤں، دیوتاؤں کا بھی خالق ہے۔

سارے مکالمہ میں آپ ایسی کوئی بات زبان سے ادا نہیں فرماتے جس سے معلوم ہو کہ آپ پہلے مشرک تھے، اور اب پہلی بار مُوَحّد ہوئے ہیں۔ اور امام رازی نے یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ وَجَّهْتُ کے ساتھ قاعدۂ نحوی کا مقتضا یہ تھا کہ وَجْهِی اِلَی الَّذِی لایا جاتا، لیکن غیرتِ تنزیہہ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ اِلٰی لا کر کوئی شائبہ یا سمت یا جہت یا مادی مرکزیت کا پیدا کیا جائے! اس لئے بجائے اِلٰی کے صرف لِ لے آیا گیا۔

اور یہ جو آپ نے اپنی قوم والوں سے مخاطبہ میں فرمایا کہ اَتُحَآجُّوْنِّیْ فِی اللہِ وَقَدْ ھَدٰىنِ تو اس مقولہ کو سادہ طور پر نہیں بلکہ ذرا حیرت و استعجاب کے لہجہ میں ادا کیجیے، جب پورا مطلب واضح ہوگا یعنی اللہ کی شان! تم مجھ سے بحث و جدال کرنے چلے ہو توحید کے مسئلہ میں جو مجھ پر بالکل کُھل چکا ہے۔ اور مجھے ہدایت علم الیقین کیا، عین الیقین کے درجہ پر مل چکی ہے۔ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ کی صراحت سے کُھل گیا کہ قوم والے بجائے اس کے کہ حضرت کی صاف سیدھی، فطری تعلیم کو مان لیتے، اُلٹے بحث و جدال میں پڑ گئے، اور لگے ان سے اُلٹی سیدھی کج بحثیاں کرنے۔ جیسا کہ ہر جاہلی مشرک قوم کا شیوہ ہے۔

(۵۷)

ہمارے رسول اور رسولِ اعظمؐ کی آمد کے تذکرے پُرانے صحیفوں اور آسمانی نوشتوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ قرآن نے اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے ان کی نشان دہی بھی بار بار کر کے ان پر حجت قائم کی ہے۔ سورۂ اعراف میں بھی یہ تذکرے ہیں۔ اور ایک جگہ تو بڑی وضاحت و تفصیل سے ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ
عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ
مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آیت ۱۵۷)

جو لوگ پیروی کرتے ہیں اس رسول و نبی کی جسے ان لوگوں نے لکھا ہوا پایا توریت اور انجیل میں، وہ انھیں نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں بُرے کاموں سے روکتا ہے، اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں بتاتا ہے، اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے، اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جو اُن پر اب تک تھیں، اُتارے دیتا ہے۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اُتارا گیا۔ سو یہی لوگ تو ہیں پوری فلاح پانے والے

يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا : جسے لکھا ہوا پاتے ہیں"، کے کھلے ہوئے معنی ہیں جس کی صفات و علامات وہ لکھی ہیں پاتے ہیں اپنے صحیفوں میں۔

اَلَّذِيْنَ سے مراد عام انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں مراد خصوصی ہے اہل کتاب سے۔ اور رسول اُمّی سے مراد بے پڑھا بھی ہو سکتا ہے (جیسا کہ آپ واقعۃً تھے) اور ام القرٰی والا بھی، اور اُمّت رکھنے والا بھی۔

اور حاصل ان سب نسبتوں کا ایک ہی ہے یعنی شخصیت محمدی۔ تو آپ کی بابت علامتیں توریت و انجیل سے، تحریف و تصحیف کے بعد بھی نہ ڈھل سکیں۔ توریت کے دو ایک حوالے آپ بھی سُن لیں۔ صحیفۂ استثناء باب ۱۸ کی پندرھویں آیت ہے:-

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا"

تم اس کی طرف کان دھریو۔"

"تیری مانند" کا اطلاق اگر ہمارے رسول پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا؟ اور پھر تیرے بھائیوں میں سے بنی اسمٰعیل اگر بنی اسرائیل کے بھائی نہ تھے تو اور کون تھے؟

دوسری آیت بھی اسی صحیفۂ استثنار کے اٹھارویں باب کی اٹھارویں آیت ہے

> "اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا، میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام ان کے منھ میں ڈالوں گا۔"

پھر وہی بھائیوں کا ذکر، اور اسرائیل کے بھائیوں، اسماعیلیوں میں سے، اور وہ بھی وحی لفظی کا دعویٰ لے کر، اور کوئی دوسرا نبی آیا ہے؟

تیسری جگہ پھر اسی صحیفہ کے باب ۲۳ کی دوسری آیت ہے:

> "خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران کے میدان میں وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے داہنے ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی"۔

سینا سے اشارہ حضرت موسیٰ کی، اور سعیر سے اشارہ حضرت عیسیٰ کی جانب ہونا جس طرح ظاہر ہے، اسی طرح مکہ کی پہاڑی فاران سے اشارہ حضرت محمدؐ کی جانب ہونا بالکل ظاہر ہے۔ آتشیں شریعت اسی رسول کی تھی۔ دس ہزار پاک نفس صحابہ کے ساتھ فتح مکہ کے وقت شہر میں داخلہ بھی ہمارے ہی رسول کا ہوا تھا۔

چوتھا حوالہ صحیفۂ پیدائش کے باب ۱۷ کی ۲۱ اکیسویں آیت کا ہے:

> "اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا، اور اسے برومند کروں گا، اور اسے بہت بڑھاؤں گا، اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے، اور میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔"

حضرت اسمٰعیل کی نسل کے حق میں یہ سارے وعدے ہمارے رسول ہی کی ذات میں پورے ہوتے ہیں۔

صحیفۂ پیدائش کا ایک اور حوالہ اس کے باب ۴۹ کی دسویں آیت کا:

" یہوداہ سے ریاست کا عصا جُدا نہ ہوگا، اور نہ حاکم اس کے پاؤں کے درمیان سے جاتا رہے گا جب تک کہ شیلا اس کے پاس نہ آجائے، اور قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی"۔

دنیا کی مختلف قومیں ہمارے رسول ہی کے عَلم کے نیچے جمع ہوئیں، اور سیلا کے معنی ہیں بھیجا جانے والا ہے۔ بھیجے جانے والے وہی نبی تھے اور انھیں کے بعد سے یہود کا اقتدار نمایاں طور پر ختم ہوا۔

اسی طرح حضرت داؤد کے ایک نغمہ میں ہے:

" میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ بس سارے لوگ ابدالآباد تیری ستائش کریں گے"۔ (زبور۔ ۴۵-۱۷)

ایک اور حوالہ بھی اسی عہد عتیق کے صحیفہ یسعیاہ کا ہے:

" دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے، میں نے روح اس پر رکھی۔ وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا۔ وہ عدالت جاری کرائے گا کہ دائم رہے اور اس کا زوال نہ ہوگا، اور نہ وہ جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا، اور بحری ممالک اس کی راہ تکیں" (باب ۴۲، آیت ۱-۴)

" میرا بندہ" اس عبارت میں صاف عَبْدُہٗ و رسُولُہٗ ہے، اور " میرا برگزیدہ" صاف " مصطفیٰ" ہے، اور جس کا " زوال نہ ہوگا" وہی تو " خاتم النبیین" ہے اور انھیں کی شریعت بحری ممالک تک پھیل گئی

یہ سارے بیانات عہد عتیق کے تھے۔ اب انجیل کی بھی سُنیے:

متی کے باب ۲۱ کی آیات ۴۳ تا ۴۴ یہ ہیں :-

"یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر جس پر وہ گرے گا اسے وہ پیس ڈالے گا۔"

جس پتھر کو اسرائیلیوں نے ہمیشہ رد کیا تھا، وہ اسمٰعیلی تھے۔ اور آخر میں اسی اسمٰعیلی نسل کے فرد کو نبوت ملی اور نبوت بھی اس شان کی کہ یہود و نصاریٰ جو بھی اس سے ٹکرائے چور چور ہو کر رہ گئے۔

انجیل لوقا میں حضرت مسیح کا بیان ہے کہ :

"رہا وہ کہ جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے، اس کو تم پر نازل کروں گا۔ لیکن جب تک عالم بالا پر سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے، اس شہر میں ٹھہرے رہو (باب ۲۴ آیت ۴۹)

جب تک ہمارے رسول کا نزول اجلال نہ ہو لیا، تقدس شہر یروشلم ہی کا قائم رہا۔ اور اس کے بعد کعبہ (واقع شہر مکہ) کی طرف منتقل ہوا۔

اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب حضرت یحییٰ کے ظہور کے بعد یروشلم سے کاہن اور آئے ان کے پاس یہ پوچھنے کے لئے کہ تو کون ہے تو سوال و جواب کے بعد ان لوگوں نے کہا کہ :

"اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے"۔ (باب اول۔ آیت ۲۶)

اس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ یہود مسیح کے علاوہ کسی اور نبی کے بھی منتظر تھے جسے وہ اپنی زبان میں "وہ نبی" کہتے تھے۔ یعنی قرآن کی زبان میں "النبی"۔

اور اسی انجیل یوحنا کے باب ، کی چالیسویں آیت ہے کہ :

"پس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا کہ بے شک یہی وہ نبی ہے۔ اوروں نے کہا یہ مسیح ہے"۔

یہ مزید ثبوت اس کا ہے کہ علاوہ مسیح کے ایک اور نبی موعود (النبی) کے آنے کا برابر انتظار ہو رہا تھا۔

اور اسی انجیل یوحنا کے باب ۱۴ کی سولھویں آیت میں خود حضرت مسیحؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے :-

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ دوسرا مددگار (یا شفیع یا وکیل) بھیجے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے"۔

تو یہ ابد تک رہنے والا بجز خاتم النبیین کے اور کون ہو سکتا ہے؟

انجیل یوحنا کے حوالے ابھی ختم نہیں ہوئے۔ اس کے باب ۱۵ کی چھبیسویں ۲۶ آیت میں حضرت مسیح کی زبان سے ہے :

"جب وہ مددگار (یا شفیع یا وکیل) آجائے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح، جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا"۔

اور یہ ابد تک ساتھ رہنے والا اور حضرت مسیح کی تصدیق کرنے والا بجز ہمارے رسول اکرمؐ کے اور کون ہو سکتا ہے؟

اور یہ سارے انجیلی حوالے جو عرض ہوئے سب انھیں انجیلوں کے ہیں جو مسیحی کلیسا کو مسلم اور ان کے ہاں مستند ہیں۔ باقی مسیح کے حواری برنابا کی انجیل، جس کا ترجمہ عربی اور انگریزی دونوں میں اسی بیسویں صدی میں ہوا ہے، اسی میں کہیں زیادہ اور اشارہ کنایہ میں نہیں بلکہ صریح و واضح الفاظ میں ہمارے نبی کی آمد کی شہادت دے رہا ہے۔

اب قرآن کی آیت میں بوجھ اُتار دینے کی جو بات ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں یہی ہے کہ اس رسول کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ اور ان پر حاکم ہوگی۔ اور وہ پیمبر انھیں نیکی کا حکم دے گا، اور بدی و خباثت کی ہر راہ روکے گا۔ اس کی شریعت جامع و کامل ہوگی۔ وہ سیاسیات، اجتماعیات، معاشرت و معیشت، اخلاق و تمدن سے ہر گندگی کو دور کرے گی۔ وہ عبادات و معاملات میں انفرادی و اجتماعی، مادّی و روحانی ہر طرح پاکیزگی اور ستھرائی کی راہیں کھولے گی۔ اور ہر شعبۂ حیات کو نورانیت و لطافت سے بھر دے گی۔

﴿۵۸﴾

اسی سورۂ اعراف میں پیمبروں اور خصوصاً سلسلۂ موسوی کی بعض تفصیلات بیان کرنے کے بعد ذکر کسی خاص شخصیت کا آیا ہے، جس نے دینی نعمتوں سے مالا مال ہونے کے بعد بھی، راہِ شقاوت و بدبختی اختیار کرلی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ٥ (آیت ۱۷۵)

اور ان لوگوں کو اُس شخص کا حال پڑھ کر سُنائیے کہ اس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ اور وہ گمراہوں میں ہو گیا۔

یہ شخص کون تھا، کہاں کا تھا، کس قوم اور زمانہ کا تھا، یہ کچھ متعین نہیں۔ اور جب قرآن اس باب میں ساکت ہے، تو کسی شخص کی تعیین پر جزم و اصرار بھی صحیح نہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اشارہ رسول اللہ ہی کے ایک معاصر امیہ بن ابی الصّلت کی جانب ہے، دوسری جماعت اکابر کا خیال ہے کہ اشارہ بنی اسرائیل کا ایک معلوم و معروف زاہد، بلعم باعور کنعانی کی جانب ہے۔ اس کا ذکر توریت کے صحیفہ، گنتی کے باب ۲۲-۲۳-۲۴ میں تفصیل، کے

ساتھ آیا ہے۔

بہر حال و بہر صورت جب انسان اپنے ارادہ سے فسق اختیار کر لیتا ہے تو شیطان اس کے ساتھ مستقل رفاقت قائم کر لیتا ہے، گویا اس پر سوار ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ
وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (آیت ۱۷۶)

اور ہم چاہتے تو اس کا مرتبہ ان نشانیوں کے ذریعہ اونچا کر دیتے لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرنے لگا۔

" زمین کی طرف مائل ہو گیا" یعنی اپنے قصد و اختیار سے دنیا کی پستیوں کی طرف جھک پڑا، اور یہ اس لئے ہوا کہ اُس نے عقیدہ و عمل کا معیار، بجائے وحی الٰہی کے، اپنے نفس کو قرار دے لیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا: یعنی اگر ہماری مشیت تکوینی یہی ہوتی کہ ہم بندہ کو بہر حال و بہر صورت مجبور کر کے حسنِ عمل کی توفیق دیتے ہی رہتے تو بندے کے ارادے میں دخل دے کر اسے بہ جبر سیدھی راہ پر ڈال دیا کرتے۔ لیکن یہ قانون ہم نے اپنا رکھا ہی نہیں ہے۔

(۵۹)

سورہ انفال اگرچہ مجموعی حیثیت سے احکام کی سورۃ خصوصاً احکامِ جہاد و مسائلِ قتال کی ہے۔ اس میں ایک موقع پر ایمان والوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی شناخت تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ
اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (آیت ۲)

ایمان والے تو بس وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے
تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو
ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔

پہلی چیز یہ معلوم ہوئی کہ ان کے دل عظمت الٰہی کے استحضار سے سہم جاتے ہیں، اور یہی حاصل ہے تقویٰ کا۔

خوف خدا و خشیت الٰہی کی تاکید اگلے صحیفہ میں بھی ہے، چنانچہ یرمیاہ نبی کے صحیفہ کے پانچویں باب کی دوسری آیت ہے:

"خداوند کہتا ہے، کیا تم مجھ سے نہیں ڈرتے ہو؟ کیا تم میرے حضور میں نہیں تھرتھراتے؟"

اور انجیل جو سرتاسر رحمت و شفقت کی سمجھی جاتی ہے، اس کے بھی صحیفہ مکاشفہ پندرھویں باب کی چوتھی آیت میں ہے:

"اے خداوند، کون تجھ سے نہ ڈرے گا، اور کون تیرے نام کی بڑائی نہ کریگا؟
کیونکہ صرف تو ہی قوی ہے"

اور آیتیں سن کر اُن کا ایمان بڑھنے لگتا ہے، قوت ایمان کی تازگی کے لحاظ سے —— یہ بیان ہوا مومنین کے صفائے قلب کا —— اور وہ ہر حال میں اللہ پر توکل رکھتے ہیں، یہ بیان ہوا اُن کی عملی حالت کا

آگے مزید تشریح ارشاد ہوتی ہے:

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝
أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ (آیت ۳-۴)

اور یہ لوگ نماز کی پابندی رکھتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے

اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ تو سچے (اور پکے) مومن ہیں۔
ان کے لئے پروردگار کے پاس مغفرت ہی مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔

یعنی حقوق اللہ میں سے نماز اور انفاق، یعنی حقوق بدنی اور حقوق مالی، دونوں کی ادائی کا پورا اہتمام رکھتے ہیں، اور محققین نے لکھا ہے کہ اعمالِ باطنی میں توکل اور اعمالِ ظاہری میں نماز و زکوٰۃ کے تصریحی ذکر سے اشارہ یہی نکلتا ہے کہ باطنی اور ظاہری زندگی میں یہی اعمال سب سے زیادہ اہم اور قابل اہتمام ہیں۔

ہمارے موجودہ دور کے لوگوں کے لئے یہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے بہترین اعمالِ ظاہری و باطنی کہہ کر کیا چیزیں پیش کی تھیں، اور خود وہ، اپنے کن گھڑے ہوئے اعمال کو کمالِ زندگی اور کمالِ اسلام سمجھ رہے ہیں!

لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ: اور یہی نص ہے اس پر کہ جیسا کامل ان حضرات کا ایمان ہے، ویسے ہی جزا بھی انھیں کامل ہی ملے گی۔

(۶۰)

ایک ہلکی سی جھلک، لیکن بڑی پُرمغز و معنی خیز، مشرکین جاہلی کی عبادت کی بھی دیکھتے چلئے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ (آیت ۳۵)

اور ان کی نماز بس خانۂ کعبہ کے پاس کیا تھیں؟ بجز سیٹی بجانے اور تالیاں بجانے کے۔ سو عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کی پاداش میں۔

دوسرے اعمالِ جاہلی جیسے تھے، وہ تو خیر تھے ہی۔ ان کی نماز اور سب سے بڑی عبادت وہی کیا تھی، بجز خانۂ کعبہ کے گرد ایک قسم کے لہو و لعب کی منہ سے سیٹیاں اور

ہاتھوں سے تالیاں!

خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ آج بھی جو غیر اسلامی اور جاہلی طریقے جاری و رائج ہیں، ان کا جزو اعظم یہی باجا گاجا، تالیاں اور سیٹیاں، اور انھیں سے ملتی جلتی شکلیں کھیل تماشہ کی ہیں یا نہیں؟ قرطبی وغیرہ فقہائے مفسرین نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ اس میں وعید ہے ان جاہل صوفیار کے لئے جو وجد و حال لا کر اچھلتے کودتے، تالیاں بجاتے اور ناچتے ہیں، اور اس کو کمال روحانی سمجھے ہوئے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں مشرکین کو جس عذاب کی وعید ہے وہ تو اس دنیا میں اس طریقہ سے پوری ہوگئی، خارق عادت نہیں، موافق عادت الٰہی، غزوات وجہاد کے ذریعہ سے، اور مشرکین کا قلع قمع چند ہی سال کے اندر ہو کر رہا۔

(۶۱)

اسلام میں قتال اب شروع ہو گیا ہے اور ۱۳، ۱۴ سال کے پورے صبر و تحمل، اور ہر طرح کی مظلومیت جھیل لینے کے بعد، اب اجازت پہلی بار مل رہی ہے قتال کی۔ بلکہ طریقہ اور مقصد بھی قتال کا بتایا جا رہا ہے۔ اہم ترین غزوہ، غزوۂ بدر ہوا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو مالِ غنیمت بھی وصول ہوا۔ اُس وقت اس مال کی تقسیم کے احکام بھی ذرا غور سے سن لیجیے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ
وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ
كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ
یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (آیت ۴۱)

اور جانے رہو کہ جو کچھ تمھیں بہ طور مال غنیمت حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے ہے، اور (رسول کے) قرابت داروں کے لئے، اور یتیموں

کے لئے، اور مسکینوں کے لئے۔ اور اگر تم اللہ اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جس کو ہم نے نازل کیا اپنے بندہ (محمدؐ) پر فیصلہ کے دن دونوں جماعتیں مقابل ہوئیں اور اللہ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

غنیمت کے لغوی معنی بہت وسیع ہیں۔ یعنی ہر اس چیز کے، جو انسان اپنی کوشش سے حاصل کرے۔ لیکن ایک محدود اور اصطلاحی معنی میں اس کا اطلاق، صرف اس حال پر ہوتا ہے جو کافروں سے حالت جنگ میں بہ زور و قوت حاصل ہو۔ اس کا ۴/۵ حصہ غازیوں میں تقسیم ہوگا اور ۱/۵ حصہ اللہ کی نذر ہوگا۔ یعنی آج کی بولی میں یہ حصہ اسلامی اسٹیٹ کا ہوگا، اور اسلامی سرکاری خزانہ میں داخل ہوگا۔ فقہ حنفی کی کتابوں (ہدایہ وغیرہ) میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ تقسیم میں یہ اللہ کا نام محض خیر و برکت کے لئے آیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی مِلک و ملوک تو دنیا کا ہر مال ہے۔ اس کے بعد رسولؐ کے حصہ کا جو نمبر ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حصہ کوئی الگ نہیں۔ یعنی اللہ اور رسول کے دو حصے الگ الگ نہیں، بلکہ کُل ایک ہی حصہ ہے۔ جو رسول کے زمانۂ حیات میں ان کی خدمت میں پیش ہوتا تھا۔ نائب الٰہی اور خلیفۃ اللہ کی خدمت میں اس کا پیش ہونا، اللہ ہی کے حضور میں پیش ہونا تھا۔ سرکاری ۱/۵ کا یہ پانچواں حصہ، یعنی کل کا ۱/۲۵ حصہ، خوب سمجھ لیجئے کہ اُس کو مل رہا ہے، جو ایک ہی وقت میں آمرِ حکومت بھی تھا، اور امیرِ عسکر بھی اور حاملِ رسالت بھی!

وفات شریف کے بعد یہ حصہ بھی فقہ حنفی کے مطابق ساقط ہو گیا۔ اور خود خلفائے راشدین کا طرزِ عمل فقہائے حنفیہ ہی کی تائید میں رہا، کہ انھوں نے رسول کا حصہ اپنی طرف منتقل نہیں کیا۔ یا دوسرا حصہ اقربائے رسول کا ہوا۔ (پہلا حصہ اللہ اور رسول کا ملا کر تو ایک ہی تھا) یہ جاں نثاروں کا وہ گروہ تھا، جس نے مکہ سے لے کر مدینہ تک ہر حال میں، ہر مصیبت میں ساتھ دیا تھا۔ اور فقہائے حنفیہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ حصہ نصرتِ قدیم کی بنا پر تھا، نہ کہ عزیز داری کی بنا پر۔ ہدایہ میں صاف ہے: انّ المراد من النص قرب النصّرة

لا اقرب القرابۃ ۔ بعد وفات نبوی، یہ حصہ بھی ساقط ہوگیا۔ اس کے بعد اُمت کے یتیموں کی کفالت و سرپرستی کا حصہ تیسرا حصہ ہوا۔ چوتھا حصہ اُمت کے مسکینوں یا ناداروں کا ہوا۔ وابن السبیل میں مسافروں کا حصہ، شاید آج دنیا کی نظروں میں بہت کھٹکے لیکن اونچے ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے، اور اونچے درجوں میں سفر کرنے والے، اور اعلیٰ موٹروں پر سفر کرنے والے، عام مسافروں کی حاجتمندی اور مصیبت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے، جنھیں پیدل یا گھوڑے، یا اونٹ کی سواری پر منزلوں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں، یا سردیوں کی کڑکڑاتی ہوئی راتیں گزارنا پڑتی ہیں۔ اور جن ملکوں میں چھوت چھات کا دَور دورہ ہے، وہاں کے دیہات میں غریب پردیسیوں پر کیا گزرتی رہتی ہے وہ اس کا تو اندازہ بھی نہیں کر سکتے

اس طرز تقسیم کو آج کی عینک سے بھی خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے۔ سرکاری خزانہ کا ۳/۵ ہی نہیں پورے کا پورا ۵/۵، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی غریب نواز و ہمدرد عوام حکومت میں رعایا کے سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقوں (یعنی لاوارث یتیموں، محتاج مسکینوں اور بے زادراہ مسافروں، پردیسیوں) کے لئے وقف ہے؟

اور آیت میں جو تلمیح یوم الفرقان یا فیصلہ کے دن کی ہے، وہ معرکۂ بدر کی جانب ہے، جب حق و باطل کے درمیان علمی اور حسی فیصلہ سب کے مشاہدہ میں آگیا، اور کفر و اسلام کے درمیان اسی پہلی مادی ٹکر نے دنیا کی تاریخ میں ایک کامیاب انقلابی دعوت کی بنیاد قائم کر دی۔ یہ جنگ رمضان سنہ ۶۲۴ عیسوی میں لڑی گئی اور مسلمان یعنی داعیان توحید اپنی بے سروسامانی کے ساتھ کُل ۳۱۳ کی تعداد میں تھے، اور مشرکین مکہ سواری اور ہتھیار کے ساز و سامان کے ساتھ ۹۵۰ کی تعداد میں .....

اَنزَلنَا (جو کچھ ہم نے اُتارا) یعنی قوت غیبی ۔ اور یہ ایجاز ہر تفصیل کا جامع ہے۔

عَلیٰ عَبدِنَا: انتہائی تشریف و تخصیص کے موقع پر رسول اللہ صلعم کا ذکر اس

عنوان سے کرنا، قرآن کریم کی بلاغت کا ایک خاص جزو ہے۔ آیت کے آخری جزو واللہ علیٰ کلِّ شیءٍ قدیرٌ ۰ میں افراد امت کو تنبیہ ہے کہ ۴/۵ جو تمہیں مل رہا ہے، اسے اپنی قوتِ بازو کا نتیجہ نہ سمجھو، اللہ جو ہر چیز پر قادر ہے، اسے اس کے فضل خاص کا نتیجہ سمجھو

۶۲

اس حرب و ضرب والی سورۃ میں دو نکتے، چلتے چلاتے ایسے بیان کر دیئے ہیں جو امت کے لئے رزم و بزم کی ہر کشمکش میں مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ پہلے نکتہ کا تخاطب براہ راست امت سے ہے، اور دوسرے کا، خود رسول سے۔ پہلے پہلا نکتہ ملاحظہ ہو:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۰ (آیت ۴۵)

اے ایمان والو جب تم سے کسی جماعت سے مڈبھیڑ ہو کر رہے، تو تم ثابت قدم رہا کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ فلاح یاب رہو۔

وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۰ (آیت ۴۶)

اور اطاعت کرو اللہ اور اُس کے رسول کی، اور آپس میں جھگڑا مت کیا کرو، ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرتے رہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہ عین موقع قتال کا ہے۔ دشمن کی فوج سامنے کھڑی ہے۔ حکم یہ نہیں ہوتا، مہذب قوموں کی طرح کہ اپنی قوم کے فخر و فتحمندی کے گیت گاؤ، بلکہ یہ کہ اللہ کا ذکر کرو کہ قلب میں قوتِ ثبات اس سے ہوگی اور قدم بھی اسی سے جمے رہیں گے۔ اور کوئی نزاع ہرگز

نہ پیدا ہونے دو نہ افرادِ اُمّت کے درمیان، نہ اپنے امیرِ لشکر یا قائدِ ملت سے، کہ یہ اندرونی کشمکش، ڈسپلن، (نظم یا اطاعت) کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔

فَتَفۡشَلُوۡا : انتشارِ قوت کا لازمی نتیجہ پست ہمتی ہے۔ اور دشمنوں پر جو رعب تمہاری یک دلی و یک جہتی کی بنا پر قائم ہوا ہے، وہ یقیناً جاتا رہے گا۔

وَاصۡبِرُوۡا یعنی جو ناخوشگوار و ناموافق حالات گرد و پیش میں پیدا ہوتے رہیں، ان پر بہر حال صبر سے کام لیتے رہو۔ صبر، محمود تو ہر حال میں ہے، موقعِ قتال پر اور زیادہ۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ : جزم اور قطعیت کے ساتھ فرما دیا گیا ہے کہ معیتِ حق خود ضامنِ نُصرت ہے۔

دوسرا اُصولی نکتہ اس سے بھی زیادہ اہم و ضروری اور زندگی کے انفرادی و اجتماعی دونوں شعبوں میں کام آنے والا، محض ضمناً، انگریزی محاورہ کے مطابق ..... By The Way یا، راہ چلتے، یہ ارشاد ہوگیا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ
حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۙ (آیت ۵۳)

یہ سب اس سبب سے کہ اللہ کسی نعمت کو جس کا انعام وہ کسی قوم پر کرچکا ہے، نہیں بدلتا، جب تک وہ لوگ اس کو بدل نہ دیں جو ان کے پاس ہے اور بیشک اللہ خوب سُننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

یعنی کوئی نعمت جو کسی قوم کو مل چکی ہوتی ہے، وہ اس سے چھین نہیں لی جاتی جب تک وہ قوم اپنی حالت اُس سے مختلف نہ کرلے، جو نزولِ نعمت کے وقت تھی۔ اپنے اندر بجائے ایمان و اطاعت کے کفر و نافرمانی اور خباثت نہ پیدا کرلے۔ نعمت اور خُبث کا اجتماع خلافِ حکمتِ الٰہی ہے۔ اس لئے پہلے خُبث پیدا ہولے گا، جب جاکر سلبِ نعمت ہوگا۔ اور نعمت کا مفہوم عام ہے۔ دنیوی، اُخروی، انفرادی و ملّی، مادّی و روحانی سب ہی قسم کی

نعمتیں اس میں آجاتی ہیں۔ ہم آپ اگر اللہ کے بتائے ہوئے اسی ایک قانونِ تکوینی کے مفہوم کو اپنے دلوں میں اُتار لیں تو آج ہمارے کتنے بگڑے ہوئے کام بن جائیں۔

(۶۳)

اتحادِ ملت کو ہم آپ، چاہے کوئی معمولی درجہ کی چیز سمجھ رہے ہوں، لیکن کتابِ الٰہی کی نظر میں وہ اللہ کی ایک بہترین و افضل ترین نعمت ہے۔ اور اس کا ذکر تاکیدِ خصوصی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَاَلَّفَ بَیْنَ
قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ
قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (آیت ۶۳)

وہ وہی ہے جس نے آپ کو (اے رسول) اپنی نصرت سے اور مومنین کے ذریعہ سے قوت دی، اور ان کے دلوں میں اتحاد پیدا کر دیا۔ اگر آپ دنیا بھر کے مال خرچ کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں اتحاد نہ پیدا کر سکتے۔ لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں اتحاد پیدا کر دیا۔ بیشک وہ بڑا قدرت والا، بڑا حکمت والا ہے۔

رسول کی ظاہری نُصرت ظاہر ہے کہ مومنین ہی کے واسطہ سے ہوتی رہی۔ اور معنوی و باطنی نُصرت، نصرتِ غیبی کی کسی نہ کسی شکل سے۔ مثلاً کبھی نزولِ ملائکہ سے۔ اللہ کی کریمی اور کارسازی ہی تھی کہ اُس نے مومنین کے دل سے دوسری رنجشیں، اور کدورتیں مٹا کر سب کو اطاعتِ دین پر یکجا و متفق کر دیا۔ بغیر اس یکجہتی کے نُصرتِ دین ممکن ہی نہ تھی۔ اور رسولؐ کو خطابِ خصوصی کر کے جو ارشاد ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دنیا بھر میں سب سے بڑھ کر صاحبِ حکمت و صاحبِ تدبیر ہیں، آپ تک، سارے ممکن مالی ذرائع استعمال کر کے بھی، نعمتِ اتحاد و اتفاق پر قادر نہ ہو سکتے۔ یہ تو محض فضلِ الٰہی کی کرشمہ سازی تھی۔ اللہ کی یہ نعمت کتنی اہم و

عظیم ہے، یہ اس کلام سے ظاہر ہے۔

وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○ وہ اپنی قدرت و قوت سے جو چاہے، اور اپنی حکمت سے مناسب طریق پر چاہے کر دکھائے۔

(۶۴)

اب آپ سورۂ براۃ یا سورۃ التوبہ پر آ گئے، اور یہیں وہ آیت ملتی ہے جو منجملہ قرآن مجید کی اُن چند آیتوں کے ہے جو مستشرقین کے طعن کی ہدف ایک مدتِ دراز سے بنی چلی آ رہی ہیں۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے اسے (بہ قول حضرت تھانوی) بے دھڑک کہہ ڈالتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ سننے والے کیا رائے قائم کریں گے۔ وہ لاکھ کیڑے ڈالیں، تمسخر کریں، بہرحال واقعہ، واقعہ ہی رہے گا، اور حقیقت آخرکار حقیقت ہی ثابت ہو کر رہے گی۔

قرآن مجید نے عقیدۂ ابن اللٰہیت کا الزام جس طرح مسیحیوں پر لگایا ہے، اسی طرح یہودیوں پر بھی۔ اور مستشرقین کی طرح یہود اس سے بھڑک رہے ہیں اور کان پکڑ کر کہہ رہے ہیں کہ حاشا یہ ہم پر اتہام ہے۔ ہم سدا کے موحد ہیں، اور ہم خدا کی بیوی بیٹا کیا جانیں۔

بات ذرا دیر میں صاف ہوگی اور جرم کے ثبوت اور پھر صفائی کی پیشی میں کچھ وقت لگے ہی گا۔ سامعین ذرا صبر و تحمل کے ساتھ سنیں۔

قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ
ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ یُضَاهِـُٔوْنَ
قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰی

يُؤْفَكُونَ ۝ (آیت ۳۰)

یہود کہتے ہیں کہ عُزَیر خدا کے فرزند (مجازی) ہیں، اور نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے فرزند (مجازی) ہیں۔ یہ ان کا قول ہے محض منہ سے بک دینے کا۔ یہ انھیں لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے قبل کافر ہو چکے ہیں اور اللہ انھیں ہلاک کرے، کہ پھر بہکے جا رہے ہیں۔

سب سے پہلے عُزَیر، عبرانی تلفظ میں عزرا کی شخصیت سے تعارف حاصل کر لیجیے۔ اسرائیل کے مذہبی نوشتوں میں ان کی شہرت کاتب توریت کی حیثیت سے ہے۔ سال وفات غالباً ۴۵۸ ق م۔ بخت نصر متوفی ۵۶۱ ق م، تاجدار ایران و عراق نے جب یہود پر حملہ کر کے انھیں کامل طور پر تباہ و برباد کر دیا، تو ایسی سخت مصیبت کے عالم میں خود توریت کے نسخے بھی ان کے پاس سے یکسر گم ہو گئے۔ تقریباً ایک صدی اسی طرح گزر گئی۔ بالآخر انھیں عُزیر نبی نے توریت کو اپنی یاد داشت سے دوبارہ لکھ دیا۔ اور اُمت یہود اس احسان عظیم کے بعد انھیں مثیل موسیٰ ماننے لگی۔ اور بعض نے غلو کر کے انھیں اس مرتبہ سے بھی بڑھا دیا /

اب دوسری بات یہ غور سے سننے کی ہے کہ قرآن میں لفظ ابن اللہ آیا ہے ولد اللہ نہیں۔ اور عربی میں ابن اور ولد الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں جیسے اُردو میں لڑکا اور بیٹا، یا انگریزی میں اور بائبل کے خاص محاورہ میں ایک Child of God دوسرا Son of God۔ ابن اللہ Child of God سے مراد صلبی یا حقیقی فرزند نہیں ہوتا، بلکہ خدا کا فرزند معنوی، مجازی، یا لاڈلا یا چہیتا ہوتا ہے۔ قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ اہل کتاب ہی کی زبان سے فقرہ نقل ہوا ہے / نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ۔ یہاں ابناء کا عطف اَحِبَّآؤُهٗ پر ہے، اور کھلے ہوئے معنی فرزند مجازی یا لاڈلے چہیتے کے ہیں۔ یہود اس معنی میں حضرت عُزیر کو مطاع کل اور محبوب خدا مانتے

اور ابن اللہ یا Child of God سے موسوم کرتے ۔

مسیحیت کی دو بنیادی گمراہیاں الگ الگ ہیں۔ ایک شدید، دوسری اشد یا شدید تر۔ ایک حضرت مسیح کو اللہ کا ولد یا بیٹا Son of God ماننا، اس عقیدہ کا ذکر جہاں قرآن میں آیا ہے، بہت ہی سخت لہجہ کے ساتھ آیا ہے .... ؛ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ (قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے) وغیرہ۔

دوسری گمراہی ہے مسیح کو ابن اللہ Child of God قرار دینا۔ یہ گمراہی بھی اگرچہ سخت اور مہلک ہے، پھر بھی ولد الٰہیت کا عقیدہ اس ابن اللّٰہیت سے کہیں اشد ہے۔ یہود اس شرک جلی تک بے شک نہیں پہونچے۔ لیکن قرآن انھیں اس کا مجرم ہی کب قرار دیتا ہے۔ البتہ ابن اللّٰہیت میں کسی حد تک وہ مسیحیوں کے ہم سطح ہو گئے اس فرق دقیق کے نکتہ تک ہمارے بعض مفسرین پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ بحر المحیط میں یہ قول نقل ہوا ہے، اور ابن عطیہ کے حوالہ سے تفسیر قرطبی میں بھی، کہ اس ابنیت سے مراد نسلی و نسبی فرزندی نہیں، بلکہ محض لاڈ اور پیار والی فرزندی مراد ہے، اور خود یہ عقیدہ بھی کفر ہی ہے۔ یہ ابنیت والی گمراہی، یہود اور نصرانیوں، دونوں میں مشترک ہے۔ اور نہ صرف انھیں دونوں میں، بلکہ یونان، مصر وغیرہ کی بہت سی قدیم و جاہلی قوموں میں۔

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ: محض ایک بکواس ہے۔ جو ان لوگوں نے بک ڈالی ہے، جسے حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ فقرہ کلام کو موکد اور زوردار بنانے کے لئے لایا گیا ہے۔

يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ: یعنی اس مہمل عقیدہ پر ان کے پاس تو کوئی دلیل ہے نہیں، نہ عقلی نہ دینی، یہ تو محض تقلید ہے، ان کافر قوموں کی جو ان سے پیشتر ہو چکی ہیں، اور خدا کی تجسیم کی قائل ہو کر عقیدۂ حلول کی ماننے والی ہوئی ہیں۔ اشارہ خصوصی مشرکین یونان کی جانب ہے کہ انھیں کے فیلسوفوں کی خام خیالیوں سے

پہلی صدی مسیحی کے یہود و نصرانی دونوں متاثر بلکہ مرعوب ہو گئے۔ اور انھیں کے مشرکانہ تعلیمات کو برابر اپنے دین کا جزو بناتے چلے گئے۔ مسیحیت پر یونانی اور رومی مذہبوں کی گہری چھاپ کی دریافت تو انیسویں صدی کے نصف آخر کے مغربی فاضلوں، کاملوں کی خصوصی تحقیقات سمجھی جاتی ہے۔ قرآن کے اس اعجاز کے قربان جائیے کہ اس نے صدیوں قبل جب Higher Criticism (تنقید عالیہ) کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ ایک اُمی کی زبان سے دنیا کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا۔ آخری ٹکڑے قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ پر حیرت ذرا نہ کیجیے۔ یہ تو عین فطرت بشری ہے کہ زبان پر ایسے موقع پر سخت بیزاری، نفرت و غصہ کے الفاظ بے ساختہ آجاتے ہیں۔ جیسے یہی کہ "خدا غارت کرے"۔ قرآن مجید نے ایسا فقرہ پڑھنے والے کی زبان سے ادا کر کے اس کے جذبات کی عین ترجمانی کا حق گویا ادا کر دیا۔

(۶۵)

اس سے ملتی ہوئی ایک اور گمراہی کا بیان قرآن مجید ہی کی زبان سے اسی سلسلہ میں سنتے چلیے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (آیت ۳۱)

ان لوگوں نے اللہ کے ہوتے ہوئے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو بھی اپنا پروردگار بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ انھیں حکم صرف یہ دیا گیا تھا کہ ایک ہی معبود (برحق) کی عبادت کریں۔ کوئی معبود نہیں اس کے سوا۔ وہ پاک ہے اس سے جو شرک یہ اس کے ساتھ کرتے ہیں۔

یعنی اہل کتاب نے اپنے علماء و مشائخ کو ایسا مستقلاً صاحب اختیار مان رکھا ہے کہ گویا وہ جو چاہیں جائز ٹھہرائیں اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دے دیں۔ سارے اختیارات شریعت و قانون سازی کے گویا انھیں کو حاصل۔ مسیحیوں کے ہاں آج بھی پوپ (پاپائے روم) بہ حیثیت نائب مسیح یہ سارے اختیارات علانیہ رکھتا ہے اور پروٹسٹنٹ بھی عملاً سارے اختیارات چرچ (کلیسا) کو سپرد کئے ہوئے تھے، اور تالمود کی اب بھی جو اہمیت ہے، محتاج بیان نہیں۔

آیت کی تفسیر ماثور بھی یہی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ نو مسلم عدی بن حاتم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اپنے معتقداؤں اور پیشواؤں کو خدا کب مانتے ہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حلال و حرام کے اختیارات اُن میں مان لینا، انھیں خدائی ہی اختیارات دے دینا اور انھیں معبودیت کے مرتبہ پر پہنچا دینا ہے۔

آیت میں عوام مسلمانوں کے لئے بڑی عبرت موجود ہے۔ انھوں نے بھی مختلف اماموں اور مشائخ کو مستقل مُطاع قرار دے کر عملاً انھیں معصومیت بلکہ خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ قرآن کی روشن آیات کو، اپنے ضمیر کی واضح شہادت کو، کھلے ہوئے مشاہدہ کو، سب چھوڑ دیں گے، لیکن اپنے شیخ کو کسی حالت میں نہ چھوڑیں گے۔ امام رازی نے یہاں پہنچ کر اپنے اُستاد کا قول نقل کیا ہے کہ میری نظر سے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جن کے سامنے میں نے اُن کے مسلک کے خلاف قرآن کی آیتیں سنائیں، انھوں نے نہ سر تسلیم خم کیا، نہ انھیں قابل التفات خیال کیا، بلکہ اُلٹے حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے کہ ان کے اسلاف کے خلاف یہ آیات قرآنی کیوں کر ہو سکتی ہیں، اور تاویل بجائے ان کے اقوال میں کرنے کے خود آیات قرآنی میں کرنا چاہتے۔ امام صاحب اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ غور سے دیکھئے تو اکثر اہلِ دنیا اسی بیماری میں مبتلا نظر آئیں گے۔

مسیحیت کی گمراہیوں میں علاوہ ابنیتِ الٰہی و اُلوہیتِ الٰہی کے ایک بڑی گمراہی

یہ بھی کہ مسیح کو مطاعِ مطلق سمجھتے۔ اور مطاعِ مطلق بھی بالکل اور براہ راست، حق تعالیٰ کے مساوی اور ہم مرتبہ اور ان کی مطاعیت چونکہ یورپ اور کلیسا کی مطاعیت سے الگ، اصلاً و مستقلاً تھی، اس لئے قرآن مجید نے اس کا ذکر بھی الگ کر کے کیا۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰـھًا وَّاحِدًا: اور یہ توحیدِ خالص کا حکم، شرک جلی و خفی کی ہر صورت سے الگ رہنے کا حکم، آج تک توریت و انجیل میں بے شمار تصرفات و تحریفات کے باوجود لکھا چلا آرہا ہے۔ مثلاً توریت میں کہ "میرے حضور تیرا دوسرا خدا نہ ہووے"۔ دیکھیے صحیفۂ خروج، باب ۲۰۔ آیت ۳۔ نیز صحیفۂ استثنا، باب ۵، آیت ۶) اور انجیل مرقس کے باب ۱۲۔ آیت ۲۹ میں ہے:

"سب حکموں میں اوّل کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ، اول یہ ہے، اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے"۔

سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ اللہ کی ذات پاک و برتر ہے، نہ صرف جاہلی مشرکوں کے کھلے ہوئے اور اجمالی شرک سے، بلکہ اہلِ کتاب کے باریک و خفی مختلف قسم کے شرکوں سے بھی۔

(۶۶)

سورۃ التوبہ کہنا چاہیئے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ جلالی سورہ ہے۔ احکامِ جہاد و قتال اور مشرکوں اور اہل کتاب، سب کے لئے وعیدوں سے لبریز۔ لیکن خاتمہ اس کا شانِ جمالی پر ہوتا ہے۔ اور جس نے خود اپنا نام رؤف و رحیم رکھا ہے، اُس نے اپنے رسول صاحبِ جمال کو بھی یہاں اسی روپ میں پیش کیا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (توبہ، آیت ۱۲۹)

بیشک تمہارے پاس ایک پیمبر آئے ہیں، تمہاری جنس میں سے۔ انھیں بہت گراں گزرتی ہے، جو چیز تمھیں مضرت پہنچاتی ہے۔ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں۔ ایمان والوں کے حق میں بڑے شفیق ہیں، مہربان ہیں۔

پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں "تم" سے کون مراد ہے۔ اور ضمیر جمع مخاطب "کُمْ" دونوں جگہ کس کے لئے ہے؟ بعض نے لکھا ہے کہ مراد اہل عرب ہیں کہ آپ انھیں کے درمیان بھیجے گئے تھے۔ لیکن قول محقق یہ ہے کہ خطاب ساری نوع انسان سے ہے۔ اور آپ کی بعثت تنہا عرب کی جانب نہیں، سارے عالم کی جانب تھی۔ کبیر اور روح المعانی دونوں میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ الخطاب للبشر علی الاطلاق۔ اور قرطبی نے یہ قول ایک مشہور امام لغت زجاج کی جانب منسوب کیا ہے۔ مشرک قوموں اور شرک مزاج گروہوں کی سمجھ ہی میں یہ نہیں آتا تھا کہ منصب رسالت پر کوئی بشر کیسے مامور ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کی بشریت پر بار بار زور دینا اسی گمراہی کے رد میں ہے۔

عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ : آپ کے مزاج کی خصوصیت یہ تھی کہ جو چیزیں شرف و مرتبۂ انسانیت کو نقصان پہنچانے والی ہیں، وہ آپ کو سخت گراں گزرتی تھیں، اور آپ کے دل پر ان کا بار رہتا تھا۔ اور آپ کو انسانی فلاح و بہبود کا جیسے، ہوکا رہتا تھا۔ تو جب آپ کی یہ شفقت ساری خلق اللہ کے لئے تھی، اور آپ کے دل میں درد نوع انسانی کے لئے تھا۔ تو خاص مومنین کے ساتھ آپ کے درجۂ رافت و کرم، درجۂ شفقت و تعلق قلب کو کون پا سکتا ہے؟

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ○ اسی درجۂ تخصیص کے اظہار کے لئے ہے۔ رافت و رحمت تو خدا کی صفات و القاب ہیں۔ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کا لقب آپ کے سوا اور مل کس کو سکتا تھا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط عَلَیْهِ

تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ٥ (آیت ۱۳۰)

اب بھی یہ لوگ اگر روگردانی کئے رہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے تو اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔

جب عرشِ الٰہی موجوداتِ عالم میں سب سے عظیم تر ہے، تو جو اس کا مالک و پروردگار ہے اس کی ماتحتی اور ملکِ کامل میں سارے موجوداتِ عالم کا ہونا بالکل ظاہر ہے۔ تو یہ لوگ اگر یہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی انکارِ حق پر قائم رہیں، تو آپ کہہ دیجئے کہ میرا حافظ و ناصر تو مالکِ حقیقی ہے۔ مجھے تمھارے انکار و اعراض سے ضرر کیا؟ میرا تکیہ اُسی ذاتِ عظیم پر ہے، نہ کہ اپنے نفس پر، یا کسی اور کی ذات پر۔

اور اسی پر اس سلسلۂ معروضات کا اختتام ہے۔

خیال یہی تھا، اور یہی دلی تمنا تھی کہ کلامِ پاک کے جتنے مقامات بیسویں صدی عیسوی کے ایک طالبِ علم کی نگاہ میں قابلِ بحث نظر آئیں، اور جہاں جہاں اس کی نگاہ ٹھٹکے اور قلب کچھ بھٹکے، سب ایک لڑی میں پرو کر ناظرین با تمکین اور سامعینِ صدر نشین کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں اور اس کی برکت سے اشکالات کے حل مل جائیں اور شک و شبہ کی راہ کے کانٹے نکل جائیں۔ دلی رنج و قلق اور بڑی ہی گہری شرمندگی و حسرت کے ساتھ عرض ہے کہ مطالعہ پورے قرآن مجید کا کیا معنی، آدھے کا بھی نہ ہو سکا۔ اور ایجاز و اختصار کی کوشش کے باوجود احاطہ صرف ایک تہائی یا ثلثِ قرآن کا ہو سکا۔

معذرت خواہی آپ ہی کے لطف و کرم سے ہے، اور عجب نہیں کہ ایک بندۂ حقیر و ناداں کی یہ محض طالبِ علمانہ کوشش آئندہ کے کسی فاضل و جیّد مفسّر

کے لئے ٹمٹماتی ہوئی روشنی کا کام دے جائے ۔ اور وہ اسی کی بنیاد پر ایک پورا منارۂ نور قائم کر جائے ۔

برادرانِ ملت ! اب رخصتی کا سلام قبول فرمائیں ۔ اور حشر میں جب ملاقات ہو تو اِدھر سے معروضات کی تشنگی کا اعتراف ہو، اور اُدھر سے آپ کی قدر افزائی کے الفاظ ہمت اور حوصلہ پیدا کر رہے ہوں، اور رحمتِ الٰہی اپنی بارش سے ہم کو، آپ کو سب کو ڈھانپ لے !

۴/۱۱/۴۵

5/2/۴۰

ختم شد

مشکلات القرآن

مطالعۂ قرآن

بیسویں صدی میں

مولٰینا عبدالماجد دریابادیؒ

ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز
میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ لاہور